طشت از بام

از

وجاہت علی (سندیلوی)

باہتمام محمد سعید پرنٹر
ادبی پریس میں چھپا

قیمت:۔ دو روپیہ بارہ آنہ (۲؍۱۲)

تعداد اشاعت:۔ ایک ہزار جلد

تاریخ اشاعت:۔ ۱۵؍ ستمبر ۱۹۴۶ء

ملنے کا پتہ

وجاہت علی سندیلوی	(نصرت منزل، سندیلہ)
کتاب خانہ دانش محل	(امین آباد، لکھنؤ)
صدیق بک ڈپو	(امین آباد، لکھنؤ)
پیپلس بک ہاؤس	(بشیشرناتھ روڈ، لکھنؤ)
دفتر ہفتہ وار پیغام	(بارود خانہ، لکھنؤ)

انتساب

سعیدہ کے نام

تری نگاہ طرب خیز کی تمنا میں
سحر کی روشن و تاباں کتاب لایا ہوں

فہرست

پیش لفظ

پیش لفظ! ایک مصنف کے لئے اپنے یا اپنی کتاب کے متعلق کچھ لکھنا آسان نہیں بلکہ انتہائی مشکل کام ہوتا ہے۔ یوں تو زندگی بھر مختلف زاویوں اور بہروپوں سے وہ اپنے ہی خاکے بنایا کرتا ہے اور انھیں میں طرح طرح کی رنگ آمیزیاں کرتا رہتا ہے لیکن ایسا کرتے وقت وہ اپنے خد و خال، محسوسات اور معتقدات پر بہت سے پردے ڈال لیا کرتا ہے لیکن جب ان پردوں کو اٹھانے کا وقت آتا ہے تو وہ بڑی پریشانی محسوس کرتا ہے اور باوجود کوشش ان سے باہر نہیں نکل پاتا ہے۔ اور نکل بھی کیسے سکتا ہے؟ ایک شخصیت میں اتنی مختلف اور متضاد شخصیتیں سموئی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان سب کی ترجمان کوئی ایک قابل فہم شخصیت پیش ہی نہیں کیجا سکتی۔ یہاں شخصیت کو میں جن معنوں میں استعمال کر رہا ہوں ان میں خود انسان کے علاوہ اس کی عملی کوششیں اور ذہنی کاوشیں بھی شامل ہیں۔

میں نے کسی آزمودہ کار مقدمہ نگار سے اس کتاب کا مقدمہ لکھوانے کی بھی کوشش نہیں کی ہے۔ کتابوں کے رواجی مقدمات بیشتر ان کے لیبلوں کا کام دیتے ہیں

اس کتاب کا کوئی مقدمہ نہیں ہے اور اس کی مثال دوا کی ایک ایسی بوتل ہے جس پر اس بات کا لیبل نہیں لگا ہو کہ اسمیں زہر ہے یا تریاق یا محض کوئی یونہی سی کھٹی میٹھی دوا۔ اس کو پڑھ کر بڈھے جوان ہو جائیں گے یا جوان بڈھے ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اصولاً میں مقدمہ بازی کو برا نہیں سمجھتا۔ بدقسمتی سے میں وکیل بھی ہوں۔ مقدمہ اگر صحیح لیبل کا نہ بھی تو کم از کم پرچہ ترکیب استعمال کا تو کام دے ہی جاتا ہے لیکن ——— لیبل دیکھتے دیکھتے طبیعت اکتا گئی ہے۔ تاریخ ولادت سے تاریخ وفات تک یہ پیچھا نہیں چھوڑتے اور بیشتر ان لیبلوں نے چیزوں کی اصلی ماہیت اور قدر و قیمت کے متعلق خطرناک قسم کی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں 'یہ اچھا ہے' 'یہ برا ہے' 'اسے مت چھونا' 'یہاں مت تھوکو' 'یہ جدید ہے' 'وہ قدیم ہے' غرضیکہ لیبل لگانے والوں نے بیچارے عام انسانوں کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو بڑی حد تک ماؤف کر دیا ہے اور ان کیلئے کسی چیز کی اچھائی یا برائی محض اس کے لیبل کی اچھائی یا برائی پر منحصر ہو کر رہ گئی ہے۔ مبادا کوئی مجھے غلط سمجھے لہذا میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کتاب پر مقدمہ لکھنے یا لکھوانے کے فوائد سے بیگانہ نہیں ہوں اور اسے کوئی جرم یا گناہ نہیں سمجھتا لیکن بندہ پرور! صرف ایک حد تک سے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے!

موجودہ دور سے قبل گزشتہ صدی کے آخر تک دوسری چیزوں کی طرح ادب بھی ذاتی اجارہ داری کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور بیشتر اس کا مقصد زندگی کے بنیادی مسائل کی پردہ پوشی ہوتی۔ اس کے علمبردار عموماً وہ لوگ ہوتے جو یا تو بیراگی اور

صوفی منش تھے یا طبقۂ امرا کے حاشیہ بردار تھے۔ وہ عوام کی مشکلات اور مصائب سے اور ان کی زندگی کی الجھنوں سے بے خبر رہتے یا رہنا چاہتے تھے۔ وہ کبھی آخرت کی تلاش میں دنیا چھوڑ دینے کی تلقین کرتے اور کبھی حسن و عشق کی ایک کھوکھلی خیالی جنت بنانے میں مصروف رہتے۔ ان کے خیال میں ادب کی پاکیزگی بھوک، غلامی، ظلم ناانصافی اور اس قسم کے دیگر موضوعات سے ملوث ہو کر جا سکتی تھی۔ وہ اگر کبھی زندگی کی پریشانیوں اور مایوسیوں کا بھی تذکرہ کرتے تو ان کی یہ کوشش انفرادی نوعیت کی ہوتی سماجی نہیں۔ وہ فرد کو سماج سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے —— خوش قسمتی سے وقت کے ساتھ ہمارے ادب کا یہ غیر فطری دور تو ختم ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ابھی پورے طور سے ہماری زندگی کے مقتضیات کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکا ہے۔

ہمیں اس وقت ایک بہت زبردست سیاسی، سماجی اور معاشی انقلاب کی ضرورت ہے اور ان سب سے پہلے ذہنی انقلاب کی اور اس ضرورت کو ہمارا ادب بڑی حد تک پورا کر سکتا ہے۔ اور اس کو کرنا چاہیے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ادب کا کام صرف انقلاب پیدا کرنا ہے یا اس کے فرائض محض ہنگامی ہوا کرتے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ تو ہم اپنے اس وقت کے مقتضیات کی بنا پر ادب سے چاہتے ہیں ورنہ درحقیقت ادب اس سے کہیں زیادہ وسیع، بلند، [illegible] اور پائیدار ہے۔ ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے۔ وہ اسی سے نکلتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اسی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے اور اسی کی طرح بے تھاہ اور بے کنار ہے۔ ادب اور زندگی یا انسانیت کے بنیادی مقاصد ایک ہونا چاہئیں اور جس طرح زندگی کے بڑھتے اور پھیلتے مقتضیات پر کوئی قید اور پابندی نہیں

لگائی جا سکتی اسی طرح ادب کے بھی۔ میرا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم اپنے ادب کو سستے پروپگنڈے یا وقتی مقتضیات کا آلہ کار بنائیں۔ کبھی نہیں۔ ادب کا مطمح نظر بنیادی صداقتوں کو اجاگر کرنا ہونا چاہیئے اسے قوم وملت۔ روایات اور اوہام۔ رسم و آئین کی پابندیوں کو ختم کرکے زندگی کی بنیادی ہم آہنگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنانا چاہیئے۔

زندگی اور ادب کے متعلق ابھی ہم میں سے بہت کے نظریات صاف اور واضح نہیں ہیں۔ وہ عام زندگی اور ادب کو علیحدہ علیحدہ چیزیں سمجھتے ہیں اور ادب کے ذریعہ زندگی کی مادی ضروریات اور حقائق سے منھ موڑ کر اپنے اوہام اور تصورات کے سبز باغ میں کھو جانا چاہتے ہیں۔ وہ کبھی 'حسن'، 'حقیقت' کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ کبھی حقائق ومعرفت اور تصوف اور روح اور خودی اور عشق اور اسی اور اسی قسم کی دیگر مبہم اصطلاحات کی کھوج میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے وہ مادی زندگی کی آلائشات سے بلند ہو جاتے ہیں لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ ان کی مادی زندگی سے بھاگنے کی کوشش دراصل مادی زندگی ہی کا ردعمل ہوتا ہے۔ وہ اپنے اوپر جو 'وجدانی حالات' اور 'الہامی کیفیات' طاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ غیر فطری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی سے تو بھاگ نہیں پاتے البتہ اس کے بہتے ہوئے دھارے سے علیحدہ ہو کر ایک دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔

انسانی جذبات، خیالات، تجربات، معتقدات اور تصورات، خواہ کتنے ہی اعلیٰ و ارفع بلند اور بے پایاں کیوں نہ ہوں، انسانی زندگی ہی کا

پرتو اور ترجمان ہوتے ہیں۔ ہمارے مفکر، فلسفی، ادیب اور شاعر بزعم خود خواہ کتنے ہی اونچے عرش پر کیوں نہ جا بیٹھیں وہ اس حقیقت مسلمہ کو جھٹلا نہیں سکتے۔ اور خود ان کو اپنی جملہ 'ذہنی کیفیات' اور 'روحانی تحریکات' کو مادّی ہی ترازو میں تولنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جب ہم ان میں سے کسی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے ان حالات۔ اقدار اور ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے جن کے درمیان انھوں نے اپنی زندگی بسر کی تھی۔

زندگی کی اساس ضروریات زندگی پر ہے اور ان ہی ضروریات زندگی نے زندگی کو سماج کے سانچے میں ڈھال دیا ہے جس کی ابتدا اسی غرض سے ہوئی تھی اور جو اسی غایت سے قائم ہے کہ ضروریات زندگی کے حصول اور تقسیم میں آسانی ہو۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک زندگی نے جتنے بھی مدارج طے کئے ہیں ان سب کا مقصد ضروریات زندگی کی پیداوار اور تقسیم کے طریقوں کو بہتر بنانا رہا ہے اور جس قدر یہ طریقے زیادہ بہتر طور سے منظم اور مرتب اور ان سے زیادہ سے زیادہ افراد مستفید اور بہرہ مند ہوتے جاتے ہیں اسی قدر زندگی یا سماج ترقی کرتا جاتا ہے اور اس کے افراد ایک دوسرے سے قریب آتے جاتے ہیں۔ اور ان کے باہمی اختلافات اور تضادات ختم ہو ہو کر وحدت کثرت میں مدغم ہوتی جاتی ہے۔ انسانی زندگی کی پوری تاریخ ذہنی اور جسمانی دونوں کا اسی روشنی میں تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

ممکن ہے کہ زندگی کو صرف ضروریات زندگی کے حصول تک محدود قرار دینے سے بہت سے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس لگے اور وہ اس کو غیر

سوچے اور مجھے بھی قبول کرنے سے انکار کردیں لیکن زندگی کے اس مقصد اولیٰ
کے متعلق سوائے چند انتہائی خود غرض ہستیوں کے یہ کسی کی خواہش علمی نہ سہی
ذہنی اور جذباتی ہی سہی نہ ہوگی کہ زندگی کو ایک ایسے شیرازہ میں مرتب کیا جائے
جس سے ہر فرد بشر کو ذہنی اور جسمانی نشوونما کا پورا پورا موقع مل سکے اور ایک
دوسرے کے مفادات میں ایسی ہم آہنگی اور ارتباط پیدا ہو جائے جس سے رشک
حسد، نفرت، جنگ اور تخریبی مقابلہ کے جذبات ایک سرے سے معدوم ہو جائیں۔
سرمایہ اور دولت چند مٹھی بھر نفوس کی ذاتی ملکیت کے چنگلوں سے آزاد ہو جائے۔
اور ضروریات زندگی کی پیداوار اور تقسیم کے ذرائع پر کوئی ایک طبقہ نہیں بلکہ
پورا سماج قابض ہو اور سماج میں ہر فرد کی حیثیت مساوی ہو۔ اور ہر فرد انتہائی
ذہنی آزادی کے ساتھ اطمینان اور بے فکری کی زندگی بسر کر سکے اور اس کی
ہر معقول ضرورت پورا کرنے کی ذمہ داری سماج پر ہو۔ ہر شخص کار آمد اور باروزگار
ہو۔ اس کی قوت برداشت سے زیادہ کام نہ لیا جائے۔ اس کی آسائش اور
تفریح اور صحت مند زندگی کا انتظام سماج کی جانب سے کیا جائے۔ بیماری
اور بڑھاپے میں خیرات کے طور پر نہیں بلکہ اس کے بنیادی استحقاق کی حیثیت
سے اس کی تیمارداری اور آرام کی کفالت سماج پر ہو۔ انسان اور انسان
کے درمیان کوئی جذبہ برتری کارفرما نہ ہو۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق مٹ جائے
اور کوئی کسی کا آقا یا غلام نہ ہو۔ مرد اور عورت زندگی کے ہر میدان میں برابری
کا درجہ رکھتے ہوں۔ بچوں کی پرورش اور پرداخت سماج کے سر ہو۔ ہر فرد مستقبل
کے افکار اور تردّدات سے بالکل آزاد ہو ـــــ اور اس مادی ترقی کے

ساتھ ہی ساتھ ذہنی اور تمدنی حیثیتوں سے بھی انسان اپنی پستیوں کو چھوڑ کر بلندیوں کی طرف پرواز کرتا چلا جائے ——————— اور جب یہ زندگی کا مقصد اولیٰ ٹھہرا تو پھر زندگی کے ہر ترقی پسند اور صحت مند شعبہ کا بھی مقصد اولیٰ ہونا چاہیے۔ اور ادب بھی زندگی کا صرف ایک شعبہ ہی ہے! اور اگر کوئی ادب ایسا نہیں کرتا تو اس کو فنا ہو جانا چاہیے کیونکہ اس کا وجود زندگی کے مقصد اولیٰ سے غداری ہے۔ زندگی کا پورا ڈھانچہ مکمل اور واحد ہے۔ اس میں مختلف شعبوں کے علیحدہ علیحدہ خانے نہیں ہیں بلکہ اعضائے جسم کی طرح ہر شعبہ دوسرے شعبہ کا دست نگر اور محتاج ہے اور سب ایک ہی رشتہ میں منسلک اور ناقابل تقسیم ہیں۔

ادب بالنفسہ خود مسائل حیات کو حل نہیں کرتا لیکن وہ ان جذبات اور رجحانات کو پروان چڑھاتا ہے جو ان مسائل کو حل کرنے کے محرک، نقیب یا پیش رو ہوا کرتے ہیں۔ زندگی کے ترجمان کی حیثیت سے وہ زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے میں امداد کرتا ہے اور اس کے متعلق صحیح زاویہ نگاہ قائم کرتا ہے ——— لیکن میں ایک بہت طولانی بحث کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہوں۔ اب مجھے کچھ اپنے افسانوں کے متعلق کہنا چاہیے۔ لیکن کیا؟

سب سے پہلے مجھے اس سوال کا جواب دینا چاہیے کہ آخر میں افسانے کیوں لکھتا ہوں اور ایک شریف آدمی کی طرح خاموشی سے کیوں نہیں زندگی بسر کرتا۔ اس سوال کا سیدھا سا جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ اسی جذبہ کے ماتحت جس کے ماتحت لوگ میونسپل کمشنر یا آنریری مجسٹریٹ ہونا چاہتے ہیں لیکن دراصل یہ بات نہیں ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ صرف یہ بات نہیں ہے۔

زمانہ کی بے انصافیاں۔ اپنے بھائیوں کی بھوک، مجبوری، ذہنی تاریکی، منافرت اور غلامی دیکھئے اور پھر میرے حال پر ماتم کیجئے۔ کہ میں صرف افسانے لکھتا ہوں اور افسانے بناتا نہیں ——— جہاں خون کی ضرورت تھی وہاں صرف روشنائی صرف کیجا رہی ہے۔ میرے افسانوں نے میرے لئے عملی زندگی کے میدان سے بھاگ جانے اور منہ چھپا لینے کے لئے ایک راہ فرار مہیا کر دی ہے جو کم از کم میں خود اپنے لئے ہرگز قابل ستائش نہیں سمجھتا۔ میرے دل میں انسان کی غیر معمولی عظمت ہے اور میرا ایمان ہے کہ کارروان انسانیت ترقی اور تعمیر کی طرف رواں ہے۔ آج ہر طرف جنگ، ظلم اور استبداد کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ غربت اور افلاس، مجبوری اور معذوری کا ایک بے پناہ طوفان امنڈتا ہی چلا آ رہا ہے۔ تعصب۔ تنفر رنگ اور نسل کے امتیازات۔ فرقہ دارانہ مناقشات اور اسی قسم کی کوتاہ قلبی کی دوسری بیماریوں کا گندا کیچڑ ہر طرف اچھالا جا رہا ہے ———

لیکن میں ان کراہوں اور آہ و بکا کی آوازوں کے درمیان بھی جرس کارروان سن رہا ہوں۔ ہم آگے بڑھ رہے ہیں! آگے بڑھ رہے ہیں! اور خواہ کچھ بھی ہو جائے آگے ہی بڑھتے جائیں گے! پرانی دنیا مر رہی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی دنیا پیدا ہو رہی ہے ——— ہم سب کے خوابوں کی دنیا! کسانوں اور مزدوروں کی دنیا! معقولیت اور سائنس کی دنیا ——— اور اس کی للکار کے مقابلہ میں ایٹم بم کے دھماکے بھی محض طفلانہ قہقہے معلوم ہوتے ہیں! انسان وقتاً فوقتاً یا تھوڑے عرصہ کے لئے راہ بھٹک سکتا ہی

لیکن مستقلاً اپنی منزل مقصود تک پہونچنے سے باز نہیں رکھا جا سکتا! میں انسان کی بنیادی نیک نفسی اور راست اقدامی کا قائل ہوں اور شاید یہی وجہ ہے کہ بصورت موجودہ مجھے ہر انسان کی خوبیوں سے زیادہ اس کی برائیوں اور کمزوریوں سے محبت اور ہمدردی ہے کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ یہ برائیاں اور کمزوریاں صرف اس کی نہیں بلکہ سارے سماج کی ہیں جنھوں نے ان کو پیدا ہونے اور پروان چڑھنے کا موقع دیا۔

میری افسانہ نویسی کی ابتدا ۱۹۳۶ء زمانہ طالب علمی سے ہوئی تھی۔ اول مزاح نگاری کی جانب رجحان رہا لیکن پھر اس میں طنز پیدا ہوا اور اب شاید تلخ نویسی کے منازل طے کر رہا ہوں۔ اس مجموعہ میں میرے کل افسانے نہیں شامل ہیں اور نہ یہ انکا انتخاب ہے۔ اس میں دو افسانے چھوڑ کر بیشتر افسانے ۱۹۴۲ء سے قبل کے لکھے ہوئے ہیں۔ گستاخ شیطان، ایک جھلک، بچے، غلام، فریب نظر یہ سب ابتدائی زمانہ کی یادگار ہیں۔ میں عموماً اپنے افسانے جلد بازی سے ایک نشست میں لکھنے کا عادی ہوں اور کبھی ان پر نظر ثانی نہیں کرتا۔ یہ میری خامیاں ہیں، اور ان کو بیان کر کے میرا مقصد کسی قسم کی عذر خواہی نہیں ہے کیوں کہ میں ان پر ہرگز متاسف نہیں ہوں۔ مجھے اگر کوئی تاسف ہے تو ایک بالکل دوسری نوعیت کا اور وہ یہ کہ ؎

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

میں اپنے افسانوں کے متعلق اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہونا چاہتا

ہوں اگر ان میں کچھ خامیاں ہیں تو یہ میرا ہی قصور ہے کہ ان خامیوں کے باوجود ان کی نعش اپنے کاندھوں پہ اٹھائے پھر رہا ہوں۔ اپنے بقیہ افسانوں کا مجموعہ 'تلخ کام' میں بہت جلد طبع کرا رہا ہوں بشرطیکہ کاغذ دستیاب ہو جائے۔

میرے افسانہ نویسی کے شوق میں جن لوگوں نے میری ہمت افزائی کی ان میں چودھری نورالحسن صاحب اڈیٹر پیغام، حیات اللہ صاحب انصاری اڈیٹر قومی آواز اور پرتاب نرائن مسلدان خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور میں ان کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

مجھے اس وقت اپنا سب سے پہلا افسانہ لکھنے کا واقعہ یاد آرہا ہے۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور جن ساتھیوں کے ساتھ رہتا ان میں ایک خاں صاحب بھی تھے جو حد سے زیادہ سیدھے سادھے دیہاتی تھے۔ اور نہیں معلوم کس ڈاکٹر (شاید مویشی والے) نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ کچی سبزی کھایا کریں۔ چنانچہ دن رات وہ مولی کے پتے۔ کرم کلہ، گوبھی وغیرہ حتیٰ کہ کچے کریلے کھایا کرتے۔

ہم سب ساتھی خاں صاحب کو ان کی اس بد مذاقی سے منع کرتے رہتے اور سمجھاتے رہتے کہ سبزی خوری انتہائی مضر صحت ہے اور ایک دن رنگ لائے بغیر نہ رہے گی لیکن خاں صاحب ہماری ایک نہیں سنتے۔ البتہ ایک روز ایک بہت بڑے مناظرہ کے بعد وہ اس پر راضی ہو گئے کہ اگر ہم لوگ یہ کہیں چھپا ہوا دکھا دیں کہ کچی سبزی کھانا مفید نہیں مضر ہے تو وہ اپنی اس عادت سے باز آجائیں گے —— اب انھیں یہ چھپا ہوا کہاں سے دکھایا جاتا؟

ہمارے ایک ساتھی فاروق نقوی نے "ڈاکٹر زیڈ، وائی چیز لکیھا۔ ایم ڈی (جرمنی)" کے نام سے کچی سبزی کھانے کے نقصانات پر ایک نہایت محققانہ مقالہ لکھا لیکن ایک مقامی ہفتہ وار کے اڈیٹر باوجود مراسم اور خوشامد اسے شایع کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ البتہ انھوں نے یہ ڈھارس دلائی کہ اگر اسی موضوع پر ہم کوئی افسانہ لکھ سکیں تو وہ اسے شاید شایع کردیں۔

افسانہ لکھنے کا کام میرے سپرد ہوا۔ کچی سبزی کے عنوان سے میں نے اپنا جو سب سے پہلا افسانہ لکھا اس کا پلاٹ یہ تھا کہ ایک ڈاکٹر نے ایک ہٹے کٹے انسان کو کچی سبزی کھانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ وہ غریب پکا ہوا کھانا چھوڑ کر صرف کچی سبزی کھانے لگا۔ چند دنوں کے بعد اس کو کمزوری محسوس ہونے لگی اور اس کی بینائی میں فرق آگیا۔ وہ گھبرایا ہوا ڈاکٹر کے پاس پہونچا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھ کر کہا کہ تمھیں دق ہوگئی ہے اور عنقریب تمھارے سرطان کا پھوڑا نکلنے والا ہے۔ تم نے شاید بہت سی کچی سبزی کھالی ہے۔ مریض نے گڑگڑا کر کہا "یہ تو آپ ہی نے بتایا تھا۔" ڈاکٹر نے افسوس کرتے ہوئے جواب دیا "میرے دوست مجھے معاف کردیں تو تم پر کچی سبزی کھانے کے نقصانات کا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔" مریض کو اس جواب سے اس قدر صدمہ پہونچا کہ فوراً اس کے قلب کی حرکت بند ہوگئی اور وہ مرگیا۔

ظاہر ہے کہ یہ کیسا افسانہ تھا لیکن بہرحال یہ ایک فرضی نام سے چھپ گیا اور ہم نے اسے لاکر خاں صاحب کو دکھایا۔ خاں صاحب اس سے قائل تو نہیں ہوئے البتہ اکثر دیکھنے میں آیا کہ وہ اسے تنہائی میں پڑھتے رہتے تھے۔

مجھے توقع ہے کہ میں اپنے ناظرین سے بہت جلد دوبارہ نیاز حاصل کرسکوں گا۔

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

وجاہت

لکھنؤ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۶ء

گلزار محل

ننھا جب پہلے پہل گلزار محل میں آیا تو اس کی عمر دس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی وہ گھر کے معمولی کاموں کے لئے تین روپیہ ماہوار پر رکھ لیا گیا۔ اس وقت گلزار محل نہ گلزار تھا نہ محل وہ شہر سے دور گاؤں کے قریب اوسر میدانوں میں ایک چھوٹی سی دو منزلہ عمارت تھی۔ نواب جمشید حسن خاں نے ایک گلزار نامی طوائف سے شادی کرلی تھی اور اسی کیلئے آبادی سے دور یہ عمارت بنوائی تھی جو بعد میں گلزار محل کے نام سے موسوم ہوگئی۔ بہت دنوں یہ عمارت ویران پڑی رہی تھی لیکن بعد میں گردش روزگار اور اپنی پہلی بیوی کی اولاد کے ہاتھوں تنگ آکر نواب صاحب نے اس کوٹھی میں گلزار اور اس کی لڑکی نجمہ کے ساتھ بود و باش اختیار کرلی۔

گھر میں ایک، ماما اور دو ملازم اور تھے۔ ننھا کو بہت دا ہی سا کام کرنا پڑتا۔ وہ بہت تیز اور ہوشیار لڑکا تھا۔ کبھی نچلا نہ بیٹھتا۔ اپنے خالی وقت میں وہ ایک غلیل لئے کھیتوں اور ویرانوں میں گھوما کرتا یا کوئلہ سے زمین پر تصویریں بناتا۔ یا پھر دوسرے نوکروں کیساتھ لڑا کرتا۔ ننھا نے گاؤں میں ایک کاشتکار لڑکے سے دوستی پیدا کرلی تھی۔ وہ ہر روز گھنٹہ دو گھنٹہ کیلئے اسکے یہاں جاتا اور اسکے کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ ننھا کے بچپن میں خود اسکا باپ ایک بڑا کاشتکار تھا۔ ننھا اسکے ساتھ کھیتوں پر جایا کرتا اور جو کچھ وہ کرتا اسکی خود بھی نقل کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن بعد میں ننھا کا باپ بے دخل کردیا گیا تھا اور اسکے کھیت نکل گئے تھے۔ ننھا بچہ ہی تھا لیکن اسکو اپنے باپ کے کھیت نکل جانے کا بڑا افسوس ہوا تھا۔

ساون کا مہینہ تھا۔ پانی بڑے زوروں سے برس کر نکل گیا تھا۔ گلزار محل کے میدان خوب تر بتر تھے۔ نہ معلوم ننھا کے دل میں کیا سمائی کہ وہ پھاوڑا لے کر باورچی خانے کے پیچھے زمین کھودنے لگا۔ زمین بہت نم تھی اور تھوڑی ہی دیر میں ایک چھوٹی سی کیاری تیار ہوگئی۔ باورچی خانے سے ایک مُٹھی دھنیا چُرا کر ننھا نے کیاری میں چھڑک دی بجبہ نواب صاحب کی سولہ سترہ سال کی لڑکی جس کو سب پیارے جمو بی بی کہتے، آگئی۔ ننھا نے دادطلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کیاری دیکھ کر مسکرانے لگی۔ "یہ کیا ہے؟"

"دھنیا بوئی ہے جمو بی بی"۔ ننھا نے خوش ہو کر کہا۔

شام کو کسی بات پر نواب صاحب کہنے لگے۔ "یہ ننھا کچھ کام نہیں کرتا واہی تباہی گھوما کرتا ہے"۔

جمو بی بی نے اس کی وکالت کی۔ "اس نے ایک کیاری بنائی ہے میاں جان!"

نواب صاحب کی خفگی کم نہ ہوئی۔ "وہ ایسی ہی حرکتیں کیا کرتا ہے فضول!"

ننھا بہت جزبز ہوا اور اس نے اسی وقت جا کر کیاری بگاڑ دی اور زمین برابر کردی۔ دوسرے دن جب جمو بی بی نے وجہ پوچھی تو اس نے منہ بسور کر کہا۔ "یہاں نواب صاحب خفا ہوتے ہیں۔ میں زمین دیکھ آیا ہوں"۔ اس نے کوٹھی سے سو گز دور اشارہ کیا۔ "اب وہاں جا کر کیاری بناؤں گا"۔ جمو بی بی ہنسنے لگی اور چلی گئی۔ اسی روز گھر بھر کی آنکھ بچا کر ننھا نے کوٹھی سے تھوڑے فاصلے پر دو تین کیاریاں تیار کردیں اور الم غلم جو کچھ اس کے ہاتھ لگا انہیں بو ڈالا۔ دھنیا، لہسن، پیاز، ترئی کے بیج اور ایک آدھ جنگلی پھول!

چار پانچ روز بعد ننھا دوڑتا ہوا جمو بی بی کے پاس آیا اور ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔ "بی بی دھنیا نکل آئی"۔

"کہاں؟" جموبی بی نے تعجب سے پوچھا۔

"چلئے دیکھئے، چل کر۔"

ننھا، جموبی بی کولے کر اپنی کیاریوں پر پہونچا اور نہایت فخر سے دھنیا کی دو چھوٹی چھوٹی برائے نام پتیاں دکھانے لگا۔ اس روز سے جموبی بی بھی ننھا کے راز میں شریک ہوگئی اور اس کو خوش کرنے کے لئے ننھا نے چار پانچ بڑی بڑی کیاریاں بنا ڈالیں اور اپنے گاؤں کے دوست کاشتکار لڑکے کے مشورے سے ان میں بہت سی ترکاریاں بو دیں۔ گھر بھر میں ننھا سب سے پیشتر جاگتا اور اٹھ کر سیدھا اپنی کیاریوں پر پہونچتا اور دن بھر میں چار پانچ گھنٹے ان ہی میں کام کرتا یا نئی کیاریاں بناتا۔ جموبی بی اس کے کام میں بڑی دلچسپی لیتی اور دو تین دفعہ اسے دیکھنے جاتی۔ وہ شہر گئی تو کئی قسم کے پھولوں کے بیج لے آئی۔ ننھا نے انھیں الگ الگ ایک کیاری میں بو دیا اور سب سے زیادہ اسی کیاری کا خیال کرتا۔ اسی میں سب سے پہلے پانی ڈالتا اور اسی کی سب سے زیادہ خدمت کرتا۔

ایک روز ہنسی ہنسی میں جموبی بی نے سارا قصہ نواب صاحب سے بیان کر دیا اور یہ بھی کہا کہ وہ ان کے ڈر سے کوٹھی کے قریب کیاریاں نہیں بناتا۔ نواب صاحب بہت خوش ہوئے اور ہنسنے لگے۔ دوسرے دن وہ خود ننھا کی کیاریاں دیکھنے گئے۔ اس کی کارگزاری پر بہت مسرور ہوئے۔ ننھا کی پیٹھ ٹھونکی اور اس کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی کیاریاں کوٹھی کے قریب بنالے۔ ننھا مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا۔ اس نے اسی روز کوٹھی کے قریب دو بڑی بڑی کیاریاں بنا ڈالیں۔ اب وہ چھپ کر نہیں بلکہ کھلم کھلا دن بھر اپنی کیاریوں میں جٹا رہتا۔ کبھی ان کو سینچتا کبھی گوڑتا اور کبھی کھاد لاکر ان میں ڈالتا۔ اس نے سمجھ لیا کہ وہ خاص اسی کام کے لئے ملازم ہے۔ دوسرے نوکر اس سے جلتے۔ نواب صاحب ہنستے اور جموبی بی اس

ہیں دلچسپی لیتی اور اس کا دل بڑھاتی۔

پانچ چھ سال گزر گئے لیکن نتھا کی مستعدی اور انہماک میں فرق نہ آیا۔ وہ روز بروز اپنے کام میں اور زیادہ پختہ اور مشاق ہوتا جاتا۔ اس نے اپنی محنت اور جانفشانی سے گلزار محل کی اوسر زمین کو لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایک ایک چپہ زمین پر اس نے دو دو تین تین دفعہ کھاد ڈالی تھی، پانچ پانچ چھ چھ دفعہ گوڑا تھا اور بیس بیس دفعہ سینچا تھا۔ کئی دفعہ وہ اپنے دوست کاشتکار کے بیل مانگ لایا اور ان کی امداد سے اوسر کی ساری زمین کو حلوہ کر ڈالا۔ اس کی خوش قسمتی سے گلزار محل سے دو ہی سو گز پر نہر نکلی تھی۔ اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ نتھا اکیلا آدمی تھا لیکن اپنی محنت کے مقابلہ میں کسی چیز کو بھی کچھ نہ سمجھتا۔ اس کی عرق ریزی اور کوہ شکن ہمت کو دیکھ کر نواب صاحب دنگ رہ گئے، اور جمو بی بی تو فرطِ مسرت سے ناچی ناچی پھرتی۔ اب گھر میں نتھا کی بڑی قدر تھی، ہر شخص اس کی عزت کرتا۔ نواب صاحب نے اسے بہت سے پھل پھول اور باغبانی کا ساز و سامان منگا دیا تھا اور اس کی ماتحتی میں ایک دوسرا آدمی بھی مقرر کر دیا تھا۔

نتھا اور جمو بی بی سارا دن اپنے باغیچہ اور باغ میں مصروف رہتے۔ گلزار محل کے چاروں طرف وسیع سبزہ زار تھا اور اس میں بڑی بڑی کیاریاں تھیں جن میں طرح طرح کے خوش رنگ پھول لہلہاتے۔ انواع انواع قسم کے گلاب کے تختے کوٹھی کے سامنے ہی تھے۔ بیلے کی خوشبودار جھاڑیاں ایک کٹہرے کی صورت میں جمو بی بی کے کمرے کے گرد لگائی گئی تھیں۔ رات کی رانی کی قطار نہر کے سمت تھی اور وہ بل کھاتی ہوئی بہت دور تک چلی جاتی۔ کیاریوں کے درمیان سرو کے چھوٹے چھوٹے درخت تھے۔ کوٹھی کی پشت پر تھوڑے فاصلہ

ے بانس کی ایک لمبی سی گزرگاہ بنائی گئی تھی اور اس پر رنگ برنگی خوشنما بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ سبزہ کے چوڑے چوڑے خطوں کے بیچ میں رنگا رنگ لالہ کی گول کیاریاں تھیں۔ مکان کے دائیں جانب کوئی سو گز کے فاصلہ پر کیلے کے درختوں کے جھنڈ تھے اور ان کی آڑ میں آم، امرود، شریفہ، نارنگی اور طرح طرح کے پھلوں کے درخت نشوونما پا رہے تھے۔ چمن بندی میں جموّ بی بی نے بڑا ملکہ حاصل کیا تھا۔ ترکیب ان کی ہوتی اور محنت نتھا کی۔ نتھا نے گلزار محل کو حقیقت میں گلزار محل بنا دیا تھا۔ معلوم ہوتا جیسے کسی نے جادو کر دیا اور ایک دم سے اوسر بنجر زمین بہشت بریں بن گئی۔ دیکھنے والوں کو اپنی آنکھوں پر شبہ ہوتا۔ وہیں جہاں کل خاک ہی خاک اور دھول اڑتی آج سینکڑوں پھول اور پتیاں جھوم رہے تھے۔ وہی کوٹھی جو چند سال پیشتر بالکل ویران اور سنسان دکھائی پڑتی آج نئی دلہن کی طرح پھولوں کی گود میں چمک رہی تھی۔ نتھا کی تعریف کرتے کرتے نواب صاحب کی زبان سوکھی جاتی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اس سے اپنی احسان مندی کا اظہار کس طرح کریں۔ نتھا کے مشورہ سے انھوں نے سبزہ کے اردگرد لوہے کا ایک کٹہرا لگوا دیا اور عین وسط میں چھوٹے چھوٹے فواروں والی ایک بہت دلکش نہر بنوا دی۔

نتھا اور جموّ بی بی سویرے سے شام تک ساری دنیا سے بےخبر اپنے ہی کام میں لگے رہتے اور رات کو بھی اسی کے متعلق سوچتے۔ ان دونوں میں ہمیشہ کچھ اس قسم کی باتیں ہوتیں۔

"بی بی ایک سرو کا درخت یہاں لگنا چاہیئے؟"

"وہ مرسل کی بیل میں پھول نہیں آئے؟"

"شریفہ کے درخت میں پانی ڈالنا ہی!"

"برجو کی پتیاں سوکھ رہی ہیں!"

"گلاب کی قلم ٹھیک نہیں بندھی!"

"یہ نالی بہت خوبصورت ہے!" وغیرہ وغیرہ۔

ننھا اپنی زندگی کے راستے پر نہایت خوش اور مگن چلا جا رہا تھا کہ دفعتاً اس کو ایک حادثہ پیش آیا ایسا جیسے کہ کوئی شخص جہاں کھڑا ہو وہیں کی زمین یکایک شق ہو جائے!

ایک روز جمو بی بی اپنے معمول کے مطابق سویرے تڑکے باغ میں نہیں آئی۔ ننھا کو بڑی فکر لگ گئی۔ وہ بار بار گلزار محل کی طرف دیکھتا اور اس کا دل کام کرنے میں نہ لگتا تھا۔ قریب دس بجے کے جمو بی بی نہایت آہستہ آہستہ خاموشی سے آئی اور چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔

"کیسی طبیعت ہے جمو بی بی؟" ننھا نے تعجب سے پوچھا۔

"ننھا!"

"بی بی!"

"میں جا رہی ہوں!" جمو بی بی کے آنسو چھلک آئے۔

"کہاں؟"

"میری شادی ہو جائے گی۔"

"کب؟" ننھا نے ابھی تک کبھی بھی اس امکان پر غور نہیں کیا تھا۔

"بہت جلد!"

دن سرعت کے ساتھ گزرنے لگے۔ ننھا اور جمو بی بی کو معلوم ہوتا جیسے وہ وقت کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہوں اور وہ سر پہ پاؤں رکھے بھاگ رہا ہو ــــــ دو تین مہینے گزر گئے!

آخر وہ دن بھی آ گیا جس کے دوسرے روز جمو بی بی گلزار محل سے سدھارنے والی تھی۔ جمو بی بی کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہ تھی لیکن اس روز وہ اور ننھا دن بھر باغ کے گوشے گوشے میں گھوما پھرا کئے اور ایک ایک پھول اور پتی کا جائزہ لیا کئے۔ جمو بی بی نے بڑی حسرت سے سب کو الوداع کہا۔ وہ بار بار ننھا سے کہتی۔ "دیکھو یہ درخت یہاں لگا دینا۔" ننھا اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہتا "بہت اچھا بی بی۔"

جمو بی بی پھر کہتی "دیکھو یہ روش ٹھیک نہیں۔"

"ٹھیک ہو جائے گی بی بی۔"

"اب کی چنبیلی خوب پھولے گی!"

"جی ہاں بی بی۔"

شادی کے دن ننھا نے پوری کوٹھی کو پھولوں کی بھرمار سے گلستاں بنا دیا۔ جمو بی بی کا اس نے جو سہرا بنایا تھا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ پورے باغ کی روح کھینچ کر اس نے گوندھ دی تھی۔ شادی میں اس نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ مختصر سی بارات آئی اور جمو بی بی کو لیکر چلی بھی گئی لیکن وہ اپنی کوٹھری سے نہ نکلا۔

ننھا کا گاؤں گلزار محل سے صرف دو کوس پر تھا۔ وہ اکثر وہاں آتا جاتا رہتا لیکن جب سے اس کے ماں باپ مر گئے تھے اس نے آنا جانا بالکل ہی ترک کر دیا تھا۔ اسے اپنے کام ہی سے فرصت نہ تھی۔ اس کے دونوں بھائی کبھی کبھار اس کو آکر دیکھ جاتے اور اس سے گھر چلنے کے لئے کہتے۔ بہت دنوں سے وہ بھی نہیں آئے تھے۔ جمو بی بی کے چلے جانے کے بعد ننھا نے باغ میں دو تین دن کام کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا جی نہ لگتا اور طبیعت

بہت گھبراتی۔ اس نے نواب صاحب سے پندرہ روز کی چھٹی لی اور اپنا کام دوسرے آدمی کے سپرد کر کے گھر چلا گیا۔ یہ اس کی سب سے پہلی چھٹی تھی ورنہ دس بارہ برس کے زمانہ میں اس نے کبھی بھی کوئی چھٹی نہ لی تھی۔ گھر جانا ہوتا تو شام کو جاتا اور سویرے لوٹ آتا۔

ننھا گھر پہونچا تو بھائیوں میں اس کی طبیعت نہ لگی۔ گاؤں بھر میں وہ ایک اجنبی کی طرح پھرا کیا۔ اس کو اپنا ایک ملاقاتی بھی نہیں ملا۔ وہ ساری دنیا سے کچھ علیحدہ سا ہو گیا تھا۔ بڑی مصیبت سے اس نے گھر میں پڑے پڑے دو دن گزارے۔ تیسرے روز وہ سارا دن بھتیجوں کے لئے گیاریاں بنایا کیا، اور چوتھے دن وہ گلزار محل جانے کے لئے تیار ہو گیا بھائیوں نے بہت روکا لیکن وہ ایک نہ مانا۔ اسے ججو بی بی کی ہدائتیں یاد آ رہی تھیں۔

نواب صاحب اس کی اتنی جلد واپس آنے پر بہت متعجب ہوئے اور سبب پوچھنے لگے۔ لیکن وہ کچھ نہ بولا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن اکی طبیعت قابو ہی میں نہ آتی اور کام کرنے میں جی نہ لگتا۔ وہ کئی دن بیکار اپنی کوٹھری میں پڑا رہا۔ معلوم ہوتا جیسے اس کے ہاتھ پیروں میں سکت ہی نہیں۔

ایک دن اس نے سن پایا کہ ججو بی بی آ رہی ہیں۔ ایک دفعہ پھر اس کی ہمت عود کر آئی اور وہ کھڑیالے کر باغ پر تعینات ہو گیا۔ اور دو ہی تین دن میں ایک ہفتہ کی تلافی کر ڈالی۔

ججو بی بی آئی تو ننھا کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور آنے کے دوسرے ہی دن وہ اپنے پرانے دستور کے مطابق سویرے تڑکے ہی باغ میں پہونچ گئی۔ ننھا کی کھوئی دلچسپی اُسے واپس مل گئی۔ وہ ججو بی بی اور باغ کو دیکھ کر پھر لہرانے لگا۔

ایک دن ججو بی بی نے ہنستے ہوئے کہا "ننھا تم شادی کیوں نہیں کر لیتے"۔

ننھا ہنسنے لگا اور چپ رہا۔

جمو بی بی نے پھر چھیڑا۔ "تمھارے ماں باپ ہوتے تو کب کی شادی ہو چکی ہوتی۔ اب تم ہی کر لو۔"

"کہاں کر لوں بی بی!"

"میں کرا دوں؟" جمو بی بی نے پوچھا۔

"کرا دیجئے۔" ننھا نے جھینپ کر کہا اور پھر بات بنانے لگا۔ "میری شادی تو اس باغ سے ہو گئی ہے۔"

"اچھا اب تم نے کہا ہی!"

جمو بی بی نے دو ہی چار دن کی کوشش میں گھر کی ماما کی لڑکی موتیا سے ننھا کی شادی کرا دی اور امرودوں کے جھنڈ کی آڑ میں ننھا کی کوٹھری بھی آباد ہو گئی۔

جس طرح گرمیوں میں تپتی ہوئی زمین پر ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آتا ہے اور چلا جاتا ہے اسی طرح جمو بی بی آئیں اور تین مہینے رہ کر پھر سسرال واپس چلی گئیں اور ننھا کو اس کے باغ میں تنہا چھوڑ گئیں۔

وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے؟ یہ کوئی ننھا سے پوچھتا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے نازک پودے تناور درخت ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے بیج پھل اور پھول میں تبدیل ہو گئے۔ اوسر زمین سبزہ زار ہو گئی۔ بنجر ٹیلے پھولوں کے تختے بن گئے۔ گلزار اور نواب صاحب مر گئے۔ اس کے دو بچے ہوئے اور ختم ہو گئے۔ اس کی جوانی کا آفتاب ڈھلنا شروع ہو گیا اور جمو بی بی بیوہ ہو گئیں۔ ہر چیز میں تغیر تھا ہر شے میں انقلاب لیکن نہیں تھا تو ننھا کے باغ میں۔ وہ سدا بہار تھا۔

ماں باپ کی موت کے تھوڑے ہی عرصہ بعد حجو بی بی بیوہ ہو گئیں۔ اپنی سسرال سے واپس آکر وہ پھر گلزار محل میں رہنے لگیں لیکن شادی کے دس سال نے ان میں بڑی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ انھیں اپنے مردہ ماں باپ شوہر اور بچوں کا غم کھائے جاتا۔ وہ بہت کم کوٹھی سے باہر نکلتیں اور باغ میں بھی برائے نام ہی دلچسپی لیتیں۔ نتھا کو ان پر بڑا ترس آتا لیکن وہ بیچارا کیا کر سکتا تھا۔ ان کو خوش کرنے کے لئے وہ باغ کے متعلق طرح طرح کی نئی ترکیبیں سوچتا اور ان سے بیان کرتا لیکن حجو بی بی ٹس سے مس نہ ہوتیں۔ ان کی یہ کیفیت ایک سال تک قائم رہی لیکن پھر دفعتاً ان کی روح کی چنگاری چمک اٹھی۔ انھوں نے رفتہ رفتہ باغ میں دلچسپی لینا شروع کی جیسے کوئی سوتے سوتے جاگ اٹھے اور پھر بہت جلد اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گئیں۔ اب وہ پھر سویرے سے شام تک باغ میں دکھائی پڑتیں۔ نتھا کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ؟

نتھا نے گلزار محل کے کونے کونے کو پرستان بنا دیا تھا۔ حد نظر تک لہلہاتے اور مسکراتے ہوئے پھولوں کی کیاریاں ہی دکھائی پڑتیں۔ دنیا بھر کے پھول سمیٹ کر نتھا نے اپنے چمن میں لگا دئے۔ خوشبودار درختوں اور بیلوں کی اس نے کچھ ایسی ترتیب کی تھی کہ ان کی خوشبو سے ہر وقت کوٹھی بسی رہتی۔ معلوم ہوتا کہ کوٹھی کیا ہے ایک عطر دان ہے۔ نتھا کی فتوحات صرف پھولوں ہی تک محدود نہ تھیں اس نے پھلوں کو بھی نہ چھوڑا تھا۔ گلزار محل میں آم، انار، انگور، سیب، سنگترہ، لیچی، شریفہ غرضکہ کوئی ایسا پھل نہ تھا جو بہتر سے بہتر موجود نہ ہو۔ گلزار محل کے سیب اور سنگترے تو سارے صوبے میں مشہور تھے۔ نئے نئے آموں کی ایجاد میں نتھا نے وہ ملکہ حاصل کیا تھا کہ آپ اپنا جواب تھا۔ آموں کی شاید ہی کوئی ایسی قسم ہو جو نتھا کی پروردہ

نہ ہو اور جس پر نمائش میں اس کو انعام نہ مل چکا ہو۔

گلزار محل کی وسعتیں روز بروز بڑھتی ہی جاتیں۔ وسیع سبزہ کے اردگرد پھلوں اور میووں کے درختوں کے جھنڈ تھے اور پچھم کی طرف تو یہ جھنڈ اتنی دور تک چلا گیا تھا کہ بالکل جنگل معلوم ہوتا۔ اتنے بڑے باغ اور باغیچے کی رکھوالی کرنا صرف ننھا ہی کے بس کی بات تھی۔ اگر وہ ایک پتی کو بھی جھلسا ہوا دیکھ لیتا تو اس کے دل میں کانٹا سا چبھ جاتا۔ وہ باغ کی ہر ایک چیز تک سب سے درست اور نہایت قاعدے اور قرینے سے رکھتا۔ قدرت نے اسے ایک عدیم المثال آرٹسٹ بنایا تھا۔ باغ کی چمک دمک دیکھ کر معلوم ہوتا جیسے ایک ایک پنکھڑی پر پالش کی ہوئی ہے۔ گلزار محل محنت کی عظمت کا ایک درخشاں شاہکار تھا۔

ایک دن وہ بھی آیا جب ننھا کے باغ کا سب سے زیادہ حسین اور شاداب پھول بھی کمہلا گیا۔ جمو بی بی چل بسیں۔ ننھا پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ پاگل سا ہو گیا۔ کئی دن تک اس پر ایسا دورہ پڑا کہ وہ باغ تک بھی نہ جا سکا۔ لیکن پھر وہ اپنے کام میں پہلی ہی مستعدی سے لگ گیا۔ اب اس کا آرٹ، ذاتیات کے مدارج سے بہت دور آگے نکل چکا تھا۔ جمو بی بی اپنی وصیت کے مطابق باغ کے ایک کنج میں دفن کی گئیں۔ ان کی قبر کے گرد ننھا نے ایک جلیل القدر باغبان کے شایانِ شان پھول پتیوں کا ایک بے نظیر مقبرہ تیار کر دیا۔

کوٹھی کے نئے مالک آ گئے لیکن ننھا ان سے غیر متعلق رہا۔ اُسے اپنے کام سے کام تھا۔ وہ دن رات اسی فکر میں رہتا کہ فلاں درخت کا تھلہا بنانا ہے۔ فلاں

کیاری گوڑنا ہے۔ فلاں سبزے میں پانی دینا ہے۔ بر جو کی بیل سوکھی جا رہی ہے اُس کے بجائے نئی لگانا ہے۔ فلاں نالی ٹھیک نہیں ہے۔ طوطے امرود کھائے جا رہے ہیں، کھٹکھٹا باندھنا ہے۔ آم کا بور ٹھیک نہیں آ رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس نے باغ کی وسعت اتنی زیادہ بڑھا رکھی تھی کہ اُسے سانس لینے کی بھی فرصت نہ تھی۔

چند سال میں نتھا کی بیوی بھی مر گئی۔ اس نے اسے امرودوں کے جھرمٹ میں توپ دیا اور اس کی قبر پر ایک تُرئی کی بیل چڑھا دی۔ اب نتھا کا دنیا میں کوئی نہ تھا ـــــ سوائے اس کے باغ کے۔

تیس برس گزر گئے! تیس برس!

دنیا کی ہر شے بدل گئی۔ ہر چیز میں انقلاب آ گیا لیکن نہیں آیا تو نتھا کے باغ میں۔ وہاں اب بھی نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کی بہار خزاں نا آشنا تھی۔ بچارا نتھا خود بھی بہت بدل گیا۔ ستر برس سے اوپر کا سن تھا۔ کمر خم ہو گئی۔ آنکھیں دھندلی پڑ گئیں۔ سارے جسم پر جھرّیوں کا جال بچھ گیا۔ ہاتھ پیر میں رعشہ آ گیا۔ اور اس کے بوڑھے دماغ میں جمو بی بی کی تصویر بھی مٹنے سی لگی۔ لیکن اس کی ہمت اور محنت میں ذرہ برابر بھی فرق نہ پڑا۔ وہ اپنے باغ کی جوانی دیکھ کر اب بھی اپنی رگوں میں تازہ خون محسوس کرتا۔ وہ اب بھی سویرے اٹھ کر باغ میں نکل جاتا اور ایک ایک پھول اور پتّی کو خود دیکھتا۔ اب وہ زیادہ کام خود نہ کر پاتا۔ اس نے

اپنی ماتحتی میں تین آدمی رکھ لئے تھے۔ ان ہی سے دن بھر کام لیا کرتا لیکن وہ ان آدمیوں سے مطمئن نہ ہوتا ہر کام میں خود اپنا ہاتھ ضرور لگاتا۔

کوٹھی میں بہت سے لوگ آئے بھی اور چلے بھی گئے، لیکن نتھا کو خبر نہ ہوئی۔ باغ کے معاملہ میں کسی کو نتھا سے بات کرنے کی بھی جرأت نہ ہوتی۔ وہ اپنے کام میں دُور دُور تک مشہور تھا۔ سب اُسے نتھا بابا کہتے تھے۔

ایک روز نتھا کو کوٹھی میں بلایا گیا۔ وہ اپنی لاٹھی ٹیکتے ہوئے پہونچا۔ کوٹھی کی نئی مالکہ ایک تند خو بیگم صاحبہ تھیں۔ انھوں نے درشتی سے کہا۔ "نتھا بابا تم اب پنشن لے لو۔"

"پنشن کیا؟" نتھا نے پوچھا۔

"کئی روز ہوئے میں نے مزدوروں سے کہا تھا کہ وہ برجو کی جھاڑیاں صاف کر ڈالیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ تم منع کرتے ہو اور خفا ہوتے ہو۔ میں روز کہتی ہوں کہ میرے گلدستے میں مرسل کے پھول ضرور ہوں لیکن تمھیں کچھ خیال نہیں۔ اب تم بہت بوڑھے ہو گئے کام کرنے کے لائق نہیں رہے۔"

"پھر یہ کام کون کرے گا؟" نتھا نے کہا۔

"کوئی کرے، تمھیں کیا؟ ہم دوسرا آدمی رکھ لیں گے۔"

"نہیں میں باغ چھوڑ کر نہیں جا سکتا!" نتھا نے غصہ سے کہا۔

"باغ ہمارا ہے ہم جو انتظام مناسب سمجھیں گے کریں گے۔ تمھارا انتظام ہمیں پسند نہیں۔"

"باغ میرا ہے۔" نتھا نے غصہ میں آپے سے باہر ہو کر کہا "میں نے ہی

باغ کو باغ بنایا ہے۔ میں نے ساٹھ سال اس میں کام کیا ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی اس میں توپ دی ہے۔"

ننھّا بڑے زوروں سے کانپ رہا تھا جیسے اُسے جاڑا آگیا ہو۔

بیگم صاحبہ ایک تلخ ہنسی ہنسیں۔ "بوڑھے بیوقوف! تم باغ میں صرف نوکر تھے۔ تم نے محنت کی تو تمھیں اس کی تنخواہ ملی۔ میں تمھیں موقوف کرتی ہوں۔"

"میں نے اوسر اور بنجر زمین کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہ باغ میرا ہے! میرا ہے! جمّو بی بی یہی کہتیں۔"

"جمّو بی بی کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ باغ ہمارا ہے، قانون میں یہی لکھا ہے۔" بیگم صاحبہ نے جھڑک کر کہا اور کمرہ سے نکل گئیں۔

ایک دم سے ننھّا کو ساری کوٹھی اور باغ آنکھوں کے سامنے ناچتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے مڑا اور بھاگا —— وہ سبزے اور کیاریوں کو روندتا ہوا بھاگتا چلا جا رہا تھا —— جیسے کسی اوسر زمین پر دوڑ رہا ہو۔ گلزار محل کے باہر وہ تھک کر کھڑا ہو گیا اور ہانپنے لگا۔ اس کی زندگی کے ساٹھ سال نکل گئے تھے۔ اب وہ پھر ایک بھولے بچّے کی طرح کھڑا تھا جس کا کہ اس دنیا میں کوئی نہ تھا —— "یہ باغ میرا نہیں ہے۔ قانون میں یہی لکھا ہے!" وہ بڑبڑایا اور بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

انتقام

رات سنسان تھی لیکن کیف و رومان سے لبریز۔ بعض وقت کی تنہائی بھی کتنی نشاط انگیز ہوتی ہے۔ جھیل شوش کے کنارے سلمیٰ خالہ کی چھوٹی سی سبز کوٹھی زمرد و بجلی کی روشنی میں انگارے کی طرح دہک رہی تھی۔ جھیل کا پانی بالکل خاموش اور ساکت تھا جیسے کوئی سفید چادر دور جھیل کے اس پار نشاط رسٹوران میں ایک اکیلی روشنی جاذب توجہ تھی ـــــ اس وقت گیارہ بجے رات کو اس روشنی کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے تھے! وہی جس کے لئے رسٹوران بدنام تھا ـــــ

سلمیٰ خالہ کتب خانہ کی قد آدم کھڑکی کھولے عجب محویت کے عالم میں اس کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سبز اُونی چادر ان کے شانوں سے کھسک کر زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی کا ایک پٹ پکڑے پاس ہی کھڑی تھی۔ مغربی ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے بہت نشہ آور تھے۔ رات رانی کی خوشبو سے سارا کمرہ اڑا جاتا۔

سلمیٰ خالہ کے چہرے کی نرم گلابی کھال چمک چمک رہی تھی۔ ان کی صاف اور شفاف بلند پیشانی رنج والم کے نشانات سے پاک تھی لیکن ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں بڑی ہی گہرائی تھی جس کو ان کی لمبی لمبی پلکیں بھی نہ چھپا سکتیں۔ ان کی اس وقت کی خود فراموشی بڑی ہی پُر فریب تھی۔

دفعتاً خالہ میری طرف مخاطب ہوئیں: "رضیہ وہ روشنی دیکھو!" انھوں نے جھیل کے اس پار کی روشنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جیسے مستقبل بعید کی کوئی امید موہوم!" میں نے کہا۔

"نہیں! جیسے ماضی بعید کی کوئی تڑپتی یاد" سلمیٰ خالہ نے ایک تلخ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں خالہ؟" میں نے پوچھا۔

"چاروں طرف کی تاریکی تو دیکھو!"

"آپ کیا یاد کر رہی ہیں؟ بتایئے؟" میں نے خالہ کا مغموم چہرہ دیکھ کر بڑی لجاجت سے ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"بتاؤں؟" بڑی محبت سے مسکراتے ہوئے خالہ میری طرف جھکیں اور کچھ کہنے ہی کو تھیں کہ پھر رک گئیں ــــ جیسے کوئی کسی پیاسے کے حلق میں پانی ڈالنے کے لئے صراحی جھکائے لیکن جیوں ہی پہلا قطرہ ٹپکنے کو ہو صراحی پھر سیدھی کر لے ـــــ میں پیاسی کی پیاسی ہی رہ گئی۔

خالہ نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا اور کہنے لگیں۔ "مستقبل بعید کی کوئی امید موہوم! تیری شادی! بڑی مکار ہے تو!"

وہ ہنس رہی تھیں لیکن میں سمجھتی کہ ان کا دل کڑھ رہا ہے۔ میں اپنی خوابگاہ کی طرف چلی گئی۔

صبح کی پہلی کرنوں میں سلمیٰ خالہ کا چہرہ اس طرح جگمگا رہا تھا جیسے ان کے ہیروں کے دیئے۔ رات کی سیاہی کے ساتھ ان کے غم کی سیاہی بھی کافور ہو چکی تھی۔ وہ اس

پھول کی طرح شاداب تھیں جیسے پہلے پہل نسیم سحر نے جگایا ہو۔ ناشتہ کے بعد ہم لوگ باغ میں ٹہلنے چلے گئے۔

"کیسی ہے یہ نئی ماما کلو" خالہ نے پوچھا۔

"بہت بری" میں نے منہ بنا کر کہا۔

خالہ بے اختیار ہنسنے لگیں "کیوں؟"

"صورت نہیں اچھی اس کی! چڑیل ہے پوری چڑیل" میں نے کہا۔

خالہ اتنا ہنسیں کہ ہنستے ہنستے بے دم ہو گئیں اور ایک بنچ پر بیٹھ گئیں۔ "چھانٹ کر رکھا ہے میں نے اس کو!"

"یہ آخر کیوں؟ آپ اپنا گھر بھوت خانہ بنانا چاہتی ہیں؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بھوتوں سے بچنے کے لئے!" خالہ ہنستی ہی چلی جاتیں۔

"جب کبھی گت کی ماما رکھو ہمیشہ اس کے پیچھے دو چار مردوئے کوٹھی کے ارد گرد ضرور پھرا کرتے۔ کتنے بدمعاش ہوتے ہیں یہ مرد۔ اچھی صورت دیکھی نہیں کہ چھپا۔ مجھے تو نفرت ہے ان کی صورت سے" اب خالہ سنجیدگی کا رنگ اختیار کر رہی تھیں "سایہ کی طرح پھرا کرتے ہیں یہ عورت کے پیچھے۔ کہاں تک بیچاری اپنی جان بچائے۔ سکینہ۔ وہی۔ تھی نہیں وہ گورے رنگ کی چھوٹی سی لڑکی! بڑا کام کرتی تھی وہ! میں نے ہی پالا پوسا بڑا کیا اس کو اور مردوؤں نے تاک لیا۔ جب دیکھو کوٹھی کے ارد گرد گھوم رہے ہیں لوگ! کوئی درخت کی آڑ میں ہے تو کوئی اصطبل میں چھپا ہوا ہے اور کوئی اپنے باپ کا گھر سمجھ کر گھسا جاتا ہے باورچی خانے میں! جان عذاب کر ڈالی، جان! پھر نکال دیا میں نے اس کو!"

"یہ آپ کی دلاری کلو تو نہیں کرتی ایسا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بھی بڑی بس کی گانٹھ ہے۔ نہ صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل۔ اس کے فراق میں بھی میں نے کل احاطہ میں ایک پرچھائیں دیکھی تھی!"

"اس بیچاری پر کون عاشق ہوگا نگوڑا!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ لیکن خالہ کی سنجیدگی کم نہ ہوئی۔

"یہ نہ ہو کہو بی بی! جوانی تو دیوانی مشہور ہی ہے۔ یہ کالی ہے تو ہوا کرے جوان تو ہے۔" میں نے کچھ بولنا چاہا لیکن خالہ نے ٹوک دیا۔ "میں تو کہتی ہوں کہ یہ لڑکیاں ہی بدمعاش ہیں آج کل کی۔ آخر میں بھی تو جوان تھی کبھی؟ مجال تھی کسی کی......"

میں نے خالہ کی طرف دیکھا وہ کچھ گھبرا سی گئیں۔ انھوں نے فوراً آنکھیں نیچی کرلیں اور کہتی ہوئی بات بھول گئیں۔ یہ کیا؟ میں سمجھ نہ سکی!

سلمیٰ خالہ میری دور کے رشتہ کی خالہ تھیں۔ بڑے دولتمند ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھیں۔ ناز و نعم سے پالی گئیں اور پندرھویں برس بڑے حوصلے اور ارمان سے شہر کے ایک ہونہار خوبرو نوجوان کو بیاہی گئیں لیکن شادی کے دو ہی برس بعد نہ ماں باپ رہے اور نہ شوہر۔ دنیا میں بیچاری بالکل ہی اکیلی رہ گئیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید بہت جلد عقد ثانی کرلیں اور اس سلسلہ میں بہت سے واقعات بھی سننے میں آئے لیکن خالہ نے اپنی بیوگی کے جامے کو کبھی نہیں اتارا۔ اپنی پرانی چار پانچ ماماؤں کے ساتھ وہ شہر کے باہر "زمرد" میں رہنے لگیں اور وہیں اپنی بیوگی کے تائیس سال نہایت سلامت روی سے کاٹ دیے۔ بیچاری مجھے بہت چاہتیں۔ میں اکثر ان کے یہاں جایا کرتی اور دو دو چار چار روز رہتی۔ بڑی خاطر کرتیں اور مثل اپنی لڑکی کے سمجھتیں۔

شہر کے باہر رہنے سے سلمی خالہ نے اپنے شہر کے رشتہ داروں سے تعلقات منقطع نہیں کر لئے تھے۔ وہ اکثر ان کے یہاں جایا کرتیں۔ اور شہر کی کوئی قابل ذکر تقریب ایسی نہ ہوتی جس میں وہ اپنی شرکت ضروری نہ سمجھتیں۔ خالہ بہت خلیق، ملنسار اور ہنس مکھ تھیں۔ باتیں کرتیں تو معلوم ہوتا پھول جھڑتے۔ جو ان سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا اور ان کی قدر کرتا۔ خالہ کی عمر پچیس کے لگ بھگ تھی لیکن ابھی تک شباب کے آثار ان کے چہرے سے صاف عیاں تھے۔ جوان لڑکیوں سے ملتیں تو ان میں ایسا گھل مل جاتیں کہ انہی میں سے ایک معلوم ہوتیں۔ لیکن خالہ کے کردار میں ایک چیز بہت زیادہ ناقابل فہم تھی ـــــــ بہت ہی زیادہ ـــــــ انھیں مردوں سے سخت نفرت تھی۔ گفتگو کا کوئی موضوع ہو لیکن وہ اپنے اس جملے کی اس میں ضرور گنجائش پیدا کر لیتیں۔ "بڑے بے وفا ہوتے ہیں یہ مردوئے!" ـــــــ اس میں ان کی جوانی کا کوئی راز پنہاں تھا! اور خالہ اس راز کو صرف اپنا ہی رکھنا چاہتیں۔

ایک روز میں نو بجے خالہ کے یہاں پہونچی۔ معلوم ہوا کہ ابھی خوابگاہ سے نہیں نکلیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا لیکن جیسے ہی میں نے پہلے زینے پر قدم رکھا میں نے دیکھا خالہ خود آ رہی ہیں۔ آج انھیں غضب کا نکھار تھا۔ چہرے کی جگمگاہٹ میں معلوم ہوتا جیسے جلد کے اندر سے کوئی روشنی نکل رہی ہو۔ خالہ عجب والہانہ انداز سے چل رہی تھیں۔ کوئی شرابی بھی کیا چلے گا! سر کی جنبشیں دیکھنے سے تعلق رکھتی۔ ہر قدم پر خمار بڑھتا ہی جاتا۔ ان کے لانبے لانبے بال بڑی بے ترتیبی سے ان کے سینے پر جہاں خود ایک حشر بپا تھا کھیل رہے تھے لیکن اس بے ترتیبی میں بھی ایک خاص ترتیب تھی جو خالہ کے حسن کار، ہاتھوں کی شرمندۂ احسان معلوم ہوتی۔ خالہ قریب آئیں تو عطردان بن گئیں۔ ان کے جسم سے عطر کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔

اس "جوشِ بہار" پر میں دنگ رہ گئی۔

میں نے سلام کیا خالہ نے لپک کر چمٹا لیا۔ اتنی زور سے کہ میں چیخ اٹھی۔

"آج کچھ رنگ بیڈھب ہے!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اتنی دیر سے آئی کُتیا! اور اوپر سے کہتی ہے کہ رنگ بیڈھب ہے۔ کیوں نہ ہو بیڈھب؟" خالہ نے چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کچھ جھینپ سی گئیں۔

"چل ناشتہ کر لے۔ آج تجھے ایک بات بتاؤں گی۔" خالہ مجھے کھینچتے ہوئے لئے چلی گئیں۔

ہم لوگ ناشتہ کے بعد نشست گاہ پہونچے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔

"پھر بتایئے خالہ! وہی بات! جو بتانے کو کہی تھی۔"

"تیرے کام کی نہیں وہ!"

"نہیں!" میں نے ٹھنک کر کہا۔

"کیا کرے گی سن کر پچیس تیس برس کی بات!"

"واہ یہ اچھی رہی! خود ہی آپ نے کہا تھا کہ ایک بات سنایئے گا!"

"تو یہ تھوڑی ہی کہا تھا کہ تو میری جان کو آجا۔ اچھا سُن!" خالہ نے اپنی آنکھیں چمکا کر کہا: "تو نے بھی کی ہے کبھی کسی سے محبت!"

"کی کیوں نہیں" میں نے کہا اور ہنسنے لگی۔

"تو میں نے بھی کی" خالہ نے کہا۔

"کس سے؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے تو بتا؟" خالہ نے کہا۔

"نہیں۔"

"نہیں۔"

میں خفا ہو کر اٹھ کر جانے لگی۔ خالہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اچھا سُن لیکن خبردار جو کسی سے کہا۔"

"کیا مجال!" میں نے اطمینان دلایا۔

"ایک مالی کے لڑکے سے!" خالہ نے شرمندگی میں اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

"پھر!"

"پھر بڑھی یہ محبت!"

"پھر!" میں نے پوچھا۔

"پھر اس نے وہی کہا جو ہر مرد ہر محبت میں کہتا ہے۔"

"کیا؟"

"بھاگ چلو میرے ساتھ یا پھر شادی کر لو۔"

"آپ نے کیا کہا؟"

"تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کہتیں؟"

"بھاگ چلوں گی۔" میں نے کہا۔

"آہ! میں نے یہ نہیں کہا! میں نے ڈانٹ دیا اس کو۔ خبردار جو ایک شریف لڑکی سے ایسی باتیں کیں۔ اپنی اوقات نہیں پہچانتے تم!"

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"چلا گیا چپ چاپ' یہ کہتا ہوا کہ ہاں مجھ بھوکے سے کون شادی کر سکتا ہے۔"

"پھر؟"

"محبت کی کشتی بھوک کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔" خالہ نے بڑی حسرت سے کہا۔

"بس!"

"نہیں! وہ پچیس برس نہیں آیا لیکن اب پھر آ گیا ہے۔"

"آ گیا ہے؟ کہاں ہے؟" میں نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

"آپ کہاں ملا؟" خالہ خاموش ہو گئی تھیں میں نے پھر چھیڑا۔

"آیا تھا مجھ سے ملنے! لیکن پرانی باتوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ آج پھر آئے گا چار بجے! وہ اب بھی ویسا ہی بانکا جوان ہے!"

"پھر کیا ارادہ ہے آپ کا!" میں فرطِ محبت سے خالہ سے لپٹ گئی۔

"جب وہ بھوکا تھا اور اب میں۔ من کی آگ تن کی آگ سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہے۔"

خالہ بے اختیار سسکیاں بھر بھر کر رونے لگیں۔ معلوم ہوتا جیسے اُن کا دل ٹوٹا جا رہا ہو۔ میں نے اب اور آگے نہیں چھیڑنا چاہا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ان کی خوش مزاجی کی کائی کے پیچھے کتنا گہرا سمندر ہے!۔

اُس دن میں تین ہی بجے خالہ کے یہاں سے چلی آئی۔ لیکن دوسرے دن سویرے ہی سے پہونچ گئی۔ وہ تنہا باغ میں چہل قدمی کر رہی تھیں اور ضرورت سے زیادہ بشاش اور مسرور نظر آتی تھیں۔

"کیا ہوا سلمیٰ خالہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہوتا کیا؟ وہ آیا اور چلا گیا!"

"کیا کہا اس نے؟" میں مارے اشتیاق کے مری جاتی۔

"اس نے اپنا انتقام لے لیا۔ پچیس برس کے بعد میرا بوجھ میرے سر سے ہٹ گیا۔ میں نے اس کی بھوک ٹھکرائی تھی اس نے میری بھوک ٹھکرا دی" خالہ نہایت اطمینان سے کہہ رہی تھیں۔

"وہ کیسے؟"

"اس نے کہا پچیس برس اُدھر تم نے سچ کہا تھا اور اب جھوٹ کہہ رہی ہو۔ سماج نے ہماری قسمتوں پر مُہر لگا دی ہے۔ تم دولتمند ہو اور میں بھک منگا۔ ہمارا تمھارا جوڑ نہیں ــــــ!"

"پھر!"

"پھر میں ہنسنے لگی اور وہ چلا گیا!"

بَدنامی

ایک تو برسات کی سڑی ہوئی اُمس اور پھر ذہنی خلجان ——— مولوی صاحب بنیائن اور تہمد پہنے گھر سے باہر نکل آئے۔ باہر گلی میں ذرا ٹھنڈک تھی۔ رات زیادہ جا چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ دائیں جانب میونسپلٹی کا دُھندلا لیمپ ٹمٹما رہا تھا۔ سامنے مرزا جعفر اپنے مکان کے دروازے پر لیٹے اس زور سے خراٹے بھر رہے تھے جیسے موسیل کی رفتار سے کوئی موٹر سائیکل چل رہی ہو۔

"استغفر اللہ" مولوی صاحب نے کہا اور ایک لمبا سا قدم اٹھا کر آگے بڑھ گئے۔

کلوا تیلی بالکل برہنہ اپنے پلنگ پر اس انداز سے دراز تھا جیسے کسی اکھاڑے میں پچھڑ گیا ہو۔ اس کی کھلی ہوئی دھوتی اس کی گردن سے لپٹی ہوئی تھی اور اس کے منہ اور ناک کے پاس کچھ بھِر بھِر ا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ اس طرح سے اس کے سر سے اوپر اُٹھے ہوئے تھے جیسے 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ لگا رہا ہو' اور اس کے پیر اس تکلیف دہ حد تک پھیلے ہوئے تھے جیسے کوئی زمیندار کسی کاشتکار کو مرغا بنا کر لگان وصول کر رہا ہو۔ کلوا کی تیلن رامی پاس ہی زمین سے چمٹی پڑی تھی۔ ایک بچہ اس کے کھلے ہوئے سینے میں پیوست تھا اور دوسرا اس کے پیروں پاس اس کے لہنگے میں گھسا جا رہا تھا۔

"نعوذ باللہ" مولوی صاحب بڑبڑائے اور بھونکتے ہوئے کتوں کی طرف بڑھے۔

گلی کے ایک نکڑ پر محلہ بھر کے کتے اپنا کوئی جلسہ منعقد کر رہے تھے۔ گھبیلا (محلہ کا سب سے بدمعاش، اور بڑا کتا جس کو اہل محلہ گھبیلا کہتے) اپنا خطبۂ صدارت پڑھ رہا تھا لیکن معترضین کے درمیان بیچارا بالکل چیمبرلین بنا ہوا تھا۔ ہر طرف سے پرجوش احتجاجی نعرے بلند ہو رہے تھے اور ایک کتے صاحب نے جو سب سے خفا معلوم ہوتے تھے اپنا دوسرا انتہائی گرجدار خطبہ شروع کر دیا۔ اس پر بڑی چل پوں مچی۔ "پھٹ بھیڈوں" نے بھی حلق صاف کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی بہت لپاڈگی بھی ہوئی لیکن قبل اس کے کہ یہ اسپین کی خانہ جنگی کی صورت اختیار کرے مولوی صاحب موقع واردات پر پہونچ گئے۔ انھوں نے مجمع پر لاٹھی چارج کر دیا۔ اور مجمع ان کو گالیاں دیتا کوستا ادھر ادھر منتشر ہو گیا۔

"کتے حرامزادے! یہ اور نیند حرام کرتے ہیں رات کو!"

سامنے والے مکان سے بڑے شور و شغب کی آوازیں آ رہی تھیں مولوی صاحب اپنی داڑھی کھجاتے مجاہدانہ انداز سے اس کی طرف بڑھے۔ اس مکان میں چند مچھ منڈے، دہریہ رہتے تھے، وہ زور زور سے اول فول بک رہے تھے۔

"ونسٹن میاں خود بھی تو جمہوریت پسند نہیں تھا!"

"یہ بڑے میاں کیا ظلم و تعدی دیکھتے نہیں ہیں؟"

"اوئی! اوئی!" ایک مسخرا لڑکا بیچ میں بولا۔

"ہٹلر کی شادی چرچل کی لڑکی سے ہو جائے۔"

"اوئی! اوئی!"

"یہ پاکستان سے زیادہ ضروری منسٹرستان اور مولویستان ہو۔ ملک کے یہ ٹکڑے ضرور ہو جانا چاہئیں۔"

"جہنم میں تمھاری ماں کے دو ٹکڑے ہو جانا چاہئیں۔" مولوی صاحب ناک بھویں سکیڑتے آگے بڑھ گئے۔

میکو بسکٹ والے کے یہاں تنور کے سامنے پانچ چھ چوڑی چکلی نعشیں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی خراٹے لے رہی تھیں۔ پاس ہی نالہ بہہ رہا تھا اور اس کی بساندھ میں ناک دی جاتی

"لاحول ولا قوۃ" مولوی صاحب ٹہلتے ہوئے دائیں جانب مڑ گئے۔

بنگو بنیہ اپنی دکان کے دروازے سے چمٹا پڑا تھا۔ اس کا ٹاٹ کھسکتے کھسکتے چبوترے کے کونے پر آ گیا تھا۔ نالی میں گرنے کے لئے اب صرف ایک کروٹ کی کسر رہ گئی تھی۔

بڈھا دھوبی جے رام گدھوں کے بیچ میں غافل پڑا تھا۔ یہ گدھے بڑے موذی تھے۔ سارے محلے کو ان سے نفرت تھی لیکن وہ ہر صبح اپنی بے پناہ ڈھینچوں سے اعلان کر دیتے کہ "ہمیں تمھاری نفرت کی کوئی فکر نہیں ہم گدھے ہیں اور گدھے ہی رہیں گے۔" محلہ بھر میں شاید ہی کوئی فرد ہو جو سویرے اپنے بستر سے ان گدھوں کو گالیاں دیتا ہوا نہ اٹھتا ہو۔ محلے میں کئی دفعہ کمیٹیاں ہوئیں کہ جے رام اور اس کے گدھوں کو محلے سے نکال دیا جائے لیکن پھر اس کی مسکینی، اس کی بے عذر خدمت اور جوان بیوی کام آ گئیں۔ محلہ بھر کے سب سفید پوشوں کی عزت کا وہی ذمہ دار تھا اور پھر یہ کیسے گوارا کیا جا سکتا کہ اس کی بیوی ایسی جوان اور چنچل دھوبن محلہ چھوڑ دے۔

کامنی دھوبن ایسی نازک مزاج بھلا گدھوں کے بیچ میں کیا سو سکتی۔ وہ دھوبی سے دس گز کے فاصلہ پر باقاعدہ بستر لگائے پلنگ پر سو رہی تھی۔ مولوی صاحب کو اس کی بدمست نیند پر بڑا رشک آیا۔

مولوی صاحب کو جوتے کا نعل ایک اینٹ پر اتفاقیہ بجا ـــــ کامنی نے انگڑائی لیتے ہوئے کروٹ لی اور سر اٹھا کر مولوی صاحب کو دیکھا لیکن شاید اندھیرے میں پہچانا نہیں۔

کتوں نے اب پھر بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے اب محلہ کے کسی دوسرے حصہ میں جلسہ شروع کر دیا تھا اور مولوی صاحب کے لاٹھی چارج کے خلاف دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے۔ غیظ و غضب کا یہ طوفان تھا کہ حاضرین جلسہ میں ہر فرد اپنی جگہ مقرر بنا ہوا تھا۔ تقاریر کی روانی اور بلاغت کا یہ عالم تھا کہ دس دس منٹ تک مقررین سانس ہی نہ لیتے۔

کامنی نے انگڑائی کچھ اس انداز سے لی تھی جیسے کسی تیر انداز نے تیر مارا۔ مولوی صاحب نے اپنے ڈنڈے اور تسبیح کی گرفت زیادہ مضبوط کر لی۔ یہ سوچنے کے لئے کہ آگے جانا چاہیئے۔ یا اب پلٹ جانا چاہیئے مولوی صاحب چند لمحوں کے لئے ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ دس ہی قدم آگے جیدن کا مکان تھا۔ یہ بہت مشتبہ گھر تھا۔ مولوی صاحب اس کے قریب بھی نہ پھٹکنا چاہتے تھے۔ جیدن کے دو جوان لڑکیاں تھیں اور بہت رات گئے تک لوگ ان کے پاس آتے جاتے رہتے۔

کامنی نے پھر کروٹ لی اور مولوی صاحب غیر ارادی طور پر دو چار قدم آگے بڑھ گئے اور بالکل ہی جیدن کے دروازے پر آ گئے۔ سامنے سے ایک پرچھائیں آتی نظر پڑی اور قبل اس کے کہ مولوی صاحب پاس ہی والی گلی میں مڑیں اس پرچھائیں نے لپک کر "سلام علیکم" کا بم پھینک دیا۔ آنے والے کی آنکھیں مولوی صاحب کی آنکھوں سے زیادہ روشن تھیں۔

"وعلیکم السلام" مولوی صاحب نے طوعاً کہا۔

"کہاں اس وقت حضرت مولانا" آنے والا قریب آ گیا۔

"تم ہو عبد اللہ! کہیں نہیں گرمی بہت تھی ٹہل رہا تھا"

"ٹہل رہے تھے مولانا یا طواف کر رہے تھے" عبد اللہ نے قہقہہ لگایا۔

مولوی صاحب کو اس موقع پر یہ مذاق بہت ناگوار گزرا تاؤ آ گیا لیکن پھر یہ سمجھ کر خون

کو گھونٹ پی کر رہ گئے اور واقعی وہ اس وقت نہایت مشتبہ مقام پر کھڑے ہیں۔

"مسجد جا رہا ہوں اب" مولوی صاحب نے نہایت معصومیت سے کہا۔ وہ عبداللہ کی دروغ بافیوں سے بہت ڈرتے تھے۔

"مسجد! ابھی اسی وقت سے۔ بڑے گھُٹے ہوئے ہو!" عبداللہ نہایت بدتمیزی سے مولوی صاحب کے زہد و تقویٰ سے انتقام لینا چاہتا تھا۔

"جیسے تم خود ہو ویسا ہی دوسرے کو سمجھتے ہو۔"

"من خوب می شناسم پیرانِ پارسا را" عبداللہ نے پھر قہقہہ لگایا۔

اب تو مولوی صاحب سٹپٹائے۔ ان کا قیافہ صحیح نکلا۔ عبداللہ اس بات کو بڑھانا چاہتا تھا اور ان کو بدنام کرنے کی فکر میں تھا۔

"بھائی چلّہ کھینچ رہا ہوں آج کل۔ اس وقت سے نفلیں پڑھتا ہوں۔"

عبداللہ بڑی حقارت سے مسکرایا۔ "دیکھوں گا میں بھی کیسے پڑھتے ہو نفلیں؟"

ذلت اور رسوائی کے خوف سے مولوی صاحب کا دل کانپ رہا تھا۔ عبداللہ ذرا کھسکا تو مولوی صاحب اپنا پیچھا چھڑانے کی خاطر مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھ گئے اور فوراً ہی دو رکعت نفلوں کی نیت باندھ دی۔ سلام پھیرا تو انھوں نے مسجد کے کٹہرے سے دیکھا کہ کامنی کے دروازے پر عبداللہ کھڑا ان کو گھور رہا ہے۔ مولوی صاحب نے پھر دو رکعت نفلوں کی نیت باندھ لی۔

نماز میں تو مولوی صاحب کی طبیعت لگی نہیں۔ وہ بار بار یہی سوچتے۔ "نہ پڑھی میں نے نماز اس وقت۔ تو بہت پریشان کرے گا سویرے۔ میں روز اس سے نماز پڑھنے کو کہتا یہ آج اسی کا بدلہ لے رہا ہے ملعون۔ جہنمی۔ شیطان ——— میلاد شریف

اور نماز کے لئے ٹوکنے کے وقت کے علاوہ کتنی رقت انگیز ہوتی ہے ایک مولوی کی زندگی!

—— یہ عبداللہ گھوم رہا ہے سانڈ کی طرح رات کے وقت اور کچھ نہیں۔ اپنی عیاشیاں خود کہتا پھرتا ہے سب سے اور کچھ نہیں —— اور میں صرف ٹہلنے چلا آیا یہاں تک۔ لعنت اللہ۔ استغفراللہ۔ نعوذ باللہ۔ لاحول ولاقوۃ!" مولوی صاحب نے پھر سلام پھیر کر دیکھا تو عبداللہ اپنی جگہ پر موجود تھا بلکہ اب تو اس کا ایک ساتھی بھی آموجود ہوا تھا۔ مولوی صاحب نے پھر نیت باندھ لی۔

"یہ کامنی کو بُری نیت سے دیکھتا تھا! نکالو اسے نکالو!" ایک لمبا تڑنگا جلاد آیا اور اس نے مولوی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا سر کے اوپر لے جا کر زور سے پھینکا —— ایک چیخ کے ساتھ مولوی صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ سویرا ہونے ہی والا تھا اور مولوی صاحب مسجد کے صحن میں سجدے میں پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے جھانک کر دیکھا تو اب بھی عبداللہ قطب کی طرح کامنی کے دروازے پر کھڑا تھا۔

اب مولوی صاحب کے لئے صبر کا یارا نہ تھا انھوں نے دانت پیس کر اپنا ڈنڈا اٹھایا اور تیزی سے مسجد کی سیڑھیوں سے اُترے ——

کامنی کے دروازے کے سامنے انگنی پر ایک سفید چادر پڑی ہوئی تھی! یہ تھا عبداللہ!!!

بھوکی

"وہ بھوکی تھی"

لیکن کسے خبر؟

کاش اگر کسی کا بھوکا ہونا بھی سماج کا کوئی گناہ ہوتا۔ اسکی خبر بھی لوگوں میں اسی طرح بجلی کی سرعت سے پہونچ جاتی جس طرح کسی شریف زادی کے کسی آوارہ کے ساتھ بھاگ جانے کی۔

مولوی نے کہا کہ وہ اس لئے بھوکی ہے کیوں کہ رزق کا دروازہ اس پر بند ہے۔

سیاست داں نے کہا کہ وہ اس لئے بھوکی ہے کیوں کہ اُسے ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں۔

شاعر نے کہا کہ وہ اس لئے بھوکی ہے تاکہ اس کے حسین لعلیں لبوں پر پپڑیاں جم جائیں اور وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین اور دل فریب ہو جائیں۔

فلسفی نے کہا کہ وہ اس لئے بھوکی ہے کیوں کہ اس کے پیٹ میں روٹی نہیں ہے۔

قانون داں نے کہا کہ وہ اس لئے بھوکی ہے کیوں کہ اس کے مرحوم شوہر نے کوئی ورثہ نہیں چھوڑا۔

ماہر معاشیات نے کہا کہ وہ اس لئے بھوکی ہے کہ کیوں کہ پیداوار کم اور آبادی زیادہ ہے۔

پیٹ بھرے نے کہا کہ وہ اس لئے بھوکی ہے کیوں کہ اسے روٹی نہیں ملی۔

بھوکے نے کہا کہ وہ اس لئے بھوکی ہے کیوں کہ بہت سے لوگ بھوکے ہیں۔

غرضیکہ جتنے مُنھ اتنی باتیں بھوک کی غرض اور وجہ کچھ بھی ہو وہ بھوکی تھی۔ روٹی کا ٹکڑا کھا کر شیر مال کی بھوکی نہیں بلکہ سوکھی روٹی کی بھوکی ایسی بھوکی کہ فلسفہ، مذہب، سیاست شعر، افسانہ، قانون، معاشیات، امیری، غریبی اور ایسے ہی دنیا کے تمام لوازمات اس کی آنکھوں میں صرف ایک تصویر، اس کے کانوں میں صرف ایک آواز اور اس کے دماغ میں صرف ایک خیال پیدا کرتے روٹی! فلسفہ کا این و آں، مذہب کا گناہ و ثواب۔ سماج کا اچھا اور بُرا۔ قانون کا جائز و ناجائز اس کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اسے تو روٹی چاہیئے تھی صرف روٹی! ساری دنیا سمٹ کر اس کے دل میں صرف ایک خواہش بن گئی تھی روٹی! بھوکا انسان دماغ سے نہیں سوچتا وہ اپنے معدہ سے سوچتا ہے۔ روٹی، روٹی، روٹی بس باقی ہوس۔

وہ بیتاب ہو کر اپنے ویران بھوکے گھر کی چار دیواری سے نکل کر سڑک پہ ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا دماغ بھی دوسرے فقیروں کی طرح اس قدر مختل تھا کہ وہ ان ہی لوگوں کو دولت کی فراوانی کی دعائیں دیتی جن کے ہاتھوں میں دولت سمٹ آنے کی وجہ سے آج وہ اور اسی کی طرح اس کے سیکڑوں بھائی بہن سڑک پر ایک ایک پیسہ کے لئے ایڑیاں رگڑتے پھرتے۔

قبل اس کے کہ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ایک آدھ بھولا بھٹکا پیسہ گرتا، سماج کے ٹھیکہ دار نے فیصلہ کر دیا کہ وہ بے غیرت رہی۔

مولوی نے فتویٰ دیدیا کہ وہ بے حیا ہے۔

ایک نوجوان نے کہا نہیں وہ حسین ہے۔ اور اس کے ہاتھ پر پیسہ رکھ دیا۔ اسکے پاس عصمت بھی تھی اور غیرت بھی تھی۔ لیکن کام آئی تو اس کی جوانی۔

دن بھر بھیک مانگ کر اسے کیا ملتا؟ چند پیسے! وہ پہلے بھی بھوکی تھی اور اب بھی۔ وہ پہلے بھوکی تھی تو اس کی بھوک میں صرف مایوسی تھی وہ اب جو بھوکی تھی تو اسکی بھوک میں زمانہ کی تلخی بھی شامل تھی اور ساتھ ہی ساتھ ایک نا معلوم جذبۂ انتقام بھی! پہلے کی بہ نسبت وہ اب زیادہ بھوکی تھی۔

جب وہ سب دروازوں پر دستک دیتے دیتے ہار گئی تو اس نے گناہ کا دروازہ کھٹکھٹایا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ دروازہ خود اس کے پاس آگیا۔ یہ دروازہ کبھی بھی کسی پر بند نہیں ہوتا۔

وہ بے تامل اندر داخل ہوگئی...............

ایک سال میں یہ طلسم بھی ٹوٹ گیا۔

وہ پھر بھکارن تھی اور ساتھ ہی ساتھ بیمار بھی۔ ایک بدصورت میلا کچیلا لڑکا اس کی گود میں تھا۔ اس نے پھر دُنیا کے سامنے ہاتھ پھیلایا "روٹی!"

سماج نے کہا یہ بدمعاش ہے اسے دھتکار دو۔

مذہب نے کہا یہ جہنمی ہے اسے سنگسار کر دو۔

قانون نے کہا اس کا سوال بے معنی ہے ہماری پوری کتاب میں کوئی دفعہ

روٹی کی نہیں!

وہ بھوکی تھی ننگی تھی، بیمار تھی۔ اس کے کیڑے پڑ رہے تھے وہ سڑ رہی تھی اس نے خودکشی کرنا چاہی لیکن بھوکے کو تو خودکشی کرنا بھی نہیں آتی وہ پکڑی گئی۔

سماج نے کہا یہ پاگل ہے اپنی جان دے رہی تھی۔

مذہب نے کہا یہ کافر ہے حرام موت مر رہی تھی۔

قانون نے کہا یہ مجرم ہے اسے جیل خانہ لے چلو۔

اُس نے کہا میں بھوکی ہوں، مجھے مرجانے دو یا روٹی دو۔

حکومت نے کہا تم بھوکی تھیں تو اس کے لئے ہمارے پاس کوئی دفعہ نہیں۔ لیکن تم مرنا چاہتی تھیں اس کے لئے تمھیں سزا ملنا چاہیئے۔

چینؔ اور جاپانؔ

(افراد)

شوچانگ } چینی قیدی
چن شانگ }
جاپانی محافظ
جاپانی جمعدار
چند چینی قیدی
چند جاپانی سپاہی

پہلا منظر

(جاپان کا فوجی جیلخانہ۔ رات کے بارہ بج چکے ہیں، برابر برابر کئی کوٹھریاں ہیں جن میں قیدی بھرے ہوئے ہیں۔ ایک مدھم لیمپ تھوڑے فاصلے پر جل رہا ہے، محافظ ٹہلتا ہوا دور نکل گیا ہے۔ اس کے بھاری بوٹوں کی آواز کھٹ کھٹ آرہی ہے۔ دو قیدی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔)

شیوچانگ ۔ کل آخری تاریخ ہے۔ شام تک ہمارا معاوضہ نہ آیا تو رات کو اول ہی وقت کھانے سے قبل ہم گولی سے اُڑا دئے جائیں گے۔

چن شانگ ۔ کل رات کو یا پرسوں سویرے؟

شیوچانگ۔ جب میعاد گزر جائے گی تو وہ شیطانی کتے ہم پر اپنا رات کا کھانا کیوں ضایع کریں گے۔

چن شانگ۔ (نفرت سے) کھانا! غلیظ سے بدتر! شیطانی کتوں کا جھوٹا۔

شیوچانگ۔ آج ہماری آخری رات ہے۔ پھر کبھی رنگین شفق پر ہم رات کی سیاہی چھاتے نہ دیکھیں گے۔ چین کی ٹھنڈی اور سہانی راتیں ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لی جائیں گی۔ آؤ چاند تاروں کو الوداع کہہ لیں۔

چن شانگ۔ الوداع!

(محافظ کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ محافظ گنگناتا ہوا آتا ہے۔ اور کوٹھریوں میں جھانکتا ہوا دور نکل جاتا ہے۔)

چن شانگ۔ کیا معلوم معاوضہ آجائے۔

شیوچانگ۔ معاوضہ نہ آئے تو اچھا۔ اسی معاوضہ کی گولیاں بنا بنا کر یہ پھر ہمارے بھائیوں کے سینے چھلنی کریں گے۔ دشمنوں کا پیٹ بھرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔

چن شانگ۔ لیکن اگر معاوضہ نہ آیا تو ہم لوگ، گولی سے اُڑا دئے جائیں گے۔

شیوچانگ۔ اڑا دئے جائیں! آج سارے چین کا کیا حشر ہو رہا ہے۔

چن شانگ۔ اگر میرے معاوضہ کی میری بیوی کو خبر ہو گئی تو وہ ضرور اپنا سیاہ پتھر بیچ کر جو اس کی دولت مند خالہ نے اس کو دیا تھا روپیہ ادا کر دے گی۔

شیوچانگ۔ میرے باپ کے پانچ لڑکے ہیں۔ دو جنگ میں کام آچکے ہیں، اس کا دل سخت ہو چکا ہے وہ میرا معاوضہ نہیں ادا کرے گا۔ لیکن میری ماں مجھ سے سب سے زیادہ

محبت کرتی ہو گیوں کہ میں سب بھائیوں سے چھوٹا ہوں، شاید وہ رو دھو کر میرے باپ کو آمادہ کر دے۔

چن شیانگ۔ اب وقت کہاں باقی رہا۔ افسوس! شاید میری بیوی کو میرے معاوضہ کی خبر نہیں ہوئی۔

(محافظ کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے، دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ محافظ ان کی کوٹھریوں کے قریب آکر کچھ ٹھٹکتا ہے۔ پھر چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دور جا کر پھر گھوم پڑتا ہے۔ کچھ دیر رکتا ہے۔ پھر آگے بڑھ جاتا ہے)

شیو چیانگ۔ بے چارہ کین شین مار ڈالا گیا۔

چن شیانگ۔ کون کین شین؟

شیو چیانگ۔ تم نے اس کا نام نہیں سنا۔ جاپان کے نوجوان ادیبوں میں وہ اپنا جواب نہ رکھتا تھا اس کے افسانے تو ہمارے چینی اخباروں میں بھی چھپ چکے ہیں۔ میرا بڑا دوست تھا جب چین آیا تھا تو ایک ہفتے میرے ساتھ ٹھہرا تھا۔

چن شیانگ۔ مجھے کسی شیطانی کتے کی موت سے ہمدردی نہیں۔

شیو چیانگ۔ وہ ہماری طرح مظلوم تھا۔

چن شیانگ۔ کوئی شیطانی کتا مظلوم نہیں، ان سب کو موت آئے۔

شیو چیانگ۔ جس طرح ہم جاپانی درندوں کے ظلم و ستم کا شکار ہیں وہ بھی تھا۔ اشتراکی اور باغیانہ افسانے لکھنے کے جرم میں بے چارہ کین شین قید کر دیا گیا تھا پھر دوسرے قیدیوں کی طرح وہ بھی جبریہ میدان جنگ میں بھیج کر کٹا دیا گیا۔ غریب کین شین!

چن شیانگ۔ اونہہ! ہمیں اپنی پڑی ہے۔ ہم نے کون گناہ کیا تھا۔ میری جوان بیوی

اور چھوٹی بچی چینا میری منتظر ہوں گی۔ آہ میرا دل گھٹا جاتا ہے۔

شیو چانگ۔ میرا کوئی منتظر نہیں.......... پانگ جھیل کے کنارے بیٹھ کر میں اپنی نظمیں لکھا کرتا۔ میری بہت سی نظمیں نامکمل پڑی میری منتظر ہوں گی۔ لیکن اب ان کو میری روشنائی نہیں میرا خون مکمل کرے گا۔

چن شیانگ۔ افسوس! میں کس گھڑی فوج میں داخل ہوا تھا بے روزگاری سے تنگ آ کر جب میں بھرتی ہونے لگا تو میری پیاری بیوی کئی دفعہ میرا دامن پکڑ کر روئی تھی۔ اسے اس شراب میں اسے کبھی نہ دیکھوں گا! چند ہی گھنٹوں کے بعد وہ بیوہ کہلائے گی اور میری آنکھوں کا تارا چینا یتیم! (رونے لگتا ہے)

شیو چانگ۔ ہمت کرو دوست! آج پورا چین بیوہ اور یتیم ہو رہا ہے۔ ہمارا بربادی کی آگ ہمارے آنسوؤں سے نہیں صرف ہمارے خون ہی سے بجھ سکتی ہے۔

چن شیانگ۔ اُف! کتنا خون؟

(محافظ چپکے سے آتا ہے اور ایک دم سے کوٹھریوں کے سامنے کھنکار کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

محافظ۔ حرامزادو! کیا تم بھاگنے کی سازش کر رہے ہو؟ میرے کوڑے کیلئے شاید ابھی تمہاری پیٹھوں پر کچھ کھال باقی ہے۔

شیو چانگ۔ خفا نہ ہو محافظ۔ کل ہماری موت کا دن ہے۔

محافظ۔ کل تمہاری موت ہو لیکن تم اس طرح کھسر پسر کر کے اسے آج ہی بلانا چاہتے ہو۔ تم چینی گیدڑ، افیونی بدمعاش رات کو سو کیوں نہیں سکتے؟

چن شیانگ۔ ہم شریف آدمی ہیں۔ ہم سے اس طرح بات نہ کیجئے۔

محافظ۔ کوئی چینی شریف نہیں۔ اگر اب تم نے کوئی بات زبان سے نکالی تو تمہاری زبان تمہاری گدی سے باہر ہوگی۔

شیو چیانگ۔ ہم اپنی موت کو صرف چند گھنٹے ملتوی کرنے کے لئے اپنی عزت نہیں بیچ سکتے۔ ہم آج اس کٹہرے میں محبان وطن کی حیثیت سے ہیں اور تو صرف چند ٹھیکروں کے پیچھے باہر کھڑا ظلم اور بے انصافی پر تلا ہوا ہے۔

محافظ۔ خاموش! تیری بوٹی بوٹی نوچ کر پھینک دوں گا۔

شیو چیانگ۔ تجھے جو کرنا ہو کر ڈال، ہم تجھ سے کسی ہمدردی کے طالب نہیں۔

محافظ۔ کمینے چور۔ اپنی اوقات پہچان۔ تیری بدزبانی کل اپنا رنگ لائے گی۔ میں اس وقت تیرے ذلیل جسم پر اپنی ایک گولی خراب نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کل کسی دوسرے چینی گیدڑ کا شکار کرے گی۔ جا خوب چیخ اور اپنی ماں کو اس کی قبر سے جگالا۔

شیو چیانگ۔ تمہاری ماں شاید پہلے ہی بھاگ چکی۔

(محافظ چلا جاتا ہے)

چن شیانگ۔ کیسی بھیانک رات ہے۔

شیو چیانگ۔ تمہارے دل کا خوف دہر اس بھیانک ہے۔

چن شیانگ۔ ہاں میں اپنی موت سے خائف ہوں۔ بہت خائف۔

شیو چیانگ۔ تمہاری طرح اگر ہر چینی خائف ہوتا تو چین کب کا جاپان کی مٹھی میں ہوتا۔

چن شیانگ۔ میں اپنے ملک سے کسی سے کم محبت نہیں کرتا۔

شیو چیانگ۔ اچھا آؤ ایک نغمہ گائیں۔ میں تمہارے دل کو گرما دوں گا۔

چن شیانگ ۔ نغمہ! اس وقت؟
شیو چانگ ۔ ہمارے پاس بہت سا وقت ہی ہے جو ہم اس وقت اور اُس وقت کی قید لگائیں۔ تمہیں ناچنے کی ہوس تو ناچ بھی لو۔
چن شیانگ ۔ محافظ خفا ہے۔
شیو چانگ ۔ خدا بھی تو خفا ہے۔ اچھا سنو! (گاتا ہے)

میری فطرت جنگ آزادی میری منزل ہو جہاد
گولیاں سینے پہ کھا کر مسکرا سکتا ہوں میں
زندہ باد اے جذبۂ آزادی جوشِ وطن
دار پر چڑھ کر بھی یہ نعرہ لگا سکتا ہوں میں
میرے مشرب میں غلامانہ خموشی ہے گناہ
مرتے مرتے بھی وطن کے گیت گا سکتا ہوں میں

(محافظ جلدی جلدی آتا ہے)

محافظ ۔ شیطان کے بچے تو بالکل ہی مجنوں ہے۔
شیو چانگ ۔ آؤ تم بھی میرے نغمے سنو۔ تم شاید ابھی اتنے سنگ دل تو نہیں ہو کہ میرے نغموں کی آگ تم کو پسیج نہ سکے۔ آؤ تم بھی ایک آدھ لمحہ کے لئے اپنے کو جاپانی نہیں بلکہ انسان سمجھنے لگو۔
محافظ ۔ آفتاب کے دیوتا کی قسم میں نے تمہارا ایسا بدحواس انسان نہیں دیکھا۔ موت کی دہشت نے تم کو بالکل ہی پاگل بنا دیا۔
شیو چانگ ۔ مجھے موت سے نہیں چند گھنٹوں کی زندگی سے دہشت ہو رہی ہے۔

محافظ۔ تم جنگ سے پہلے چین میں کیا کرتے تھے؟

شیوچانگ۔ ہانگ کانگ یونیورسٹی میں فلسفہ اور ادب کا طالب علم تھا۔

محافظ۔ کیا تمہارے ادب اور فلسفے نے تمہارے ملک کو بچا لیا۔

شیوچانگ۔ کم از کم مجھے اس قعر ذلت سے بچا لیا جس میں تم پڑے ہو۔

محافظ۔ پھر تم بدتمیزی پر آمادہ ہوئے!

شیوچانگ۔ محافظ! کیا تم ایمانداری سے سمجھتے ہو کہ آج تمہارا ملک جو ہمارے ملک سے کر رہا ہے حق بجانب کر رہا ہے!

محافظ۔ تمہاری قوم کا گناہ تمہاری کمزوری ہے۔

شیوچانگ۔ بیشک کمزوری گناہ ہے لیکن تمہاری انسانیت، غیرت اور حمیت بھی تو کوئی چیز ہے۔ بھوکے غریب نہتے چینیوں کو توپ دم کر دینا، ان کا گھر بار لوٹ لینا، ان کے خوشنما مکانوں، اور باغوں کو مٹی میں ملا دینا، یونیورسٹیوں، اور کتب خانوں کو آگ لگا دینا۔ کیا تمہاری طاقت کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں؟

محافظ۔ چین کے خون سے ہماری نشوونما ہوتی ہے۔ تم ہماری آبیاری کرتے ہو۔

چن شیانگ۔ آہ میری بیوی! میری پیاری چنا۔!

شیوچانگ۔ کیا چین کے خون سے تمہاری ساری قوم کی نشوونما ہوتی ہے؟ (منہ بنا کر) پیارے محافظ ان نعروں اور مقولوں کو نہ دہراؤ جن کے دھوکے سے تم بھرتی کئے گئے ہو۔ جاپان کے صرف مٹھی بھر انسان یہ چاہتے ہیں کہ چین کا سستا کچا مال ان کو ملے۔ اور اپنے بنائے ہوئے مال سے وہ چین کے بازاروں پر قابض ہو جائیں۔ کیا ان ہی کا نام قوم ہے۔ وہ خونخوار درندے محض اپنے تھوڑے سے ذاتی فائدے کے لئے لاکھوں کروڑوں

جاپانیوں اور چینیوں کا خون کرا رہے ہیں۔ وہ کسی کے دوست نہیں۔ جو وہ ہم چینیوں کے ساتھ کرتے ہیں وہی تم جاپانیوں کے ساتھ بھی روا رکھتے ہیں۔ ان کا وطن اور ان کا مذہب صرف روپیہ ہے۔ محافظ تم آج چند ٹکوں کی خاطر اپنا سر ہتھیلی پر لئے پھرتے ہو جنگ کے لئے تم نے کچھ چندہ بھی دیا ہوگا۔ اور تم پر کچھ ٹیکس بھی پڑتا ہوگا۔ لیکن یاد رکھو کل مال غنیمت میں تم کو ایک پائی بھی نصیب نہ ہوگی۔ چند خود غرض لالچی خون خواروں کے ہم تم یکساں شکار ہیں۔

محافظ۔ جاپان میں بھی کچھ لوگ ایسی ہی باتیں کرتے تھے، ان کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔

شیوچانگ۔ لیکن ان کی اس طرح کی زبان بندی ان کی زبانوں سے زیادہ چیخ چیخ کر حقیقت کو آشکار کرے گی۔ کیا آج جاپان میں بھوک اور غربت سے مزدور نہیں مر رہے ہیں؟ کیا وہاں بے روزگاروں کا ہجوم نہیں؟ کیا وہاں ننگوں اور بھوکوں کی کمی ہے؟

محافظ۔ سچ کہتے ہو قیدی۔

شیوچانگ۔ جنگ ہم غریبوں کی موت ہے اور سرمایہ داروں کا مشغلہ بیکاری۔ آج دنیا میں ہر جگہ یہی ہو رہا ہے۔ وطن اور ملت کی کوئی قید نہیں، دنیا میں صرف ایک تفریق ہے۔ ظالم اور مظلوم۔ ظالم کی چھری ہر جگہ مظلوم کے حلق پر ہے۔

محافظ۔ قیدی! مجھے بھی جنگ سے سخت نفرت ہے۔ میں فوج میں کبھی داخل نہ ہوتا، مجھے جبریہ بھرتی کیا گیا۔ ہمارے یہاں کوئی بالغ مرد فوج کی بھرتی سے بچ نہیں سکتا۔ ٹاکنگ کے قصبہ میں جب ہماری رسد ختم ہوگئی تو ہم نے پہلے تو سارے مردوں کو قتل کر دیا۔ پھر دوسرے دن جب بیواؤں، اور یتیموں کو قتل کرنے کی باری آئی تو سچ جاننا خوف اور دہشت سے

میرے سارے جسم میں لرزہ پڑ گیا۔ اُف خداوند!

شیو چانگ۔ اور خداوند یہ سب کچھ دیکھتا ہے! غریب بیکس چین!

محافظ۔ سڑکوں پر جب میں انسانی خون کے دھارے بہتا دیکھتا تو میرا اپنا خون جم جاتا۔

شیو چانگ۔ غلام چینیوں سے مردہ چینی بہتر ہیں۔

محافظ۔ ایک پانچ برس کی چینی لڑکی نے جب گولی کھانے سے چند سکنڈ پہلے بڑی معصومیت سے روٹی مانگی تو شاید ہی کوئی ایسا سنگدل ہو جو آب دیدہ نہ ہو گیا ہو۔

شیو چانگ۔ ٹانگناں میں ہماری بہنوں کو بے عزت بھی تو کیا گیا؟

محافظ۔ ہاں شام کو مردوں کے قتل کے بعد ہر سپاہی نے ایک عورت چھانٹ لی تھی۔

شیو چانگ۔ بالکل اسی طرح جیسے جاپان میں سرمایہ دار مزدوروں کی بہنیں اور بیٹیاں چھانٹتے ہیں۔

محافظ۔ قیدی مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ افسوس کہ میں تمہاری رہائی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے اس کیلئے مجھے معاف کر دو۔

شیو چانگ۔ ہم تم دونوں مظلوم ہیں۔ آؤ ہاتھ ملائیں۔

(دونوں ہاتھ ملاتے ہیں)

محافظ۔ تمہارا ساتھی سو گیا؟

چن شیانگ۔ میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ میں سو نہیں سکتا۔

(کھٹ کھٹ آواز سنائی دیتی ہے)

شیو چانگ۔ کون؟

محافظ۔ خاموش! جمعدار آ رہا ہے۔ میری ڈیوٹی ختم ہے۔ الوداع!

شیوچانگ۔ الوداع۔

(جمعدار آتا ہے)

جمعدار۔ اپنی ماں کی اولاد کیا تو سو رہا ہے؟

محافظ۔ نہیں جناب! میں نے پلک تک نہیں جھپکائی۔ سب ٹھیک ہے۔

جمعدار۔ چینی قیدی نیند میں اپنی موت کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

محافظ۔ افیونی بدمعاش! اپنی زندگی کے آخری لمحے بھی پینک میں گزار رہے ہیں۔

جمعدار۔ ان کی مائیں جاپانی سپاہیوں کے ساتھ بھاگ رہی ہیں۔

(دونوں قہقہہ لگاتے ہیں)

محافظ۔ الوداع جمعدار۔ (چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر

(صبح کا وقت۔ چینی قیدی کوٹھڑیوں میں بیٹھے ہیں۔
چن شیانگ ٹہل رہا ہے۔ کئی جاپانی سپاہی محافظ
کے پیچھے آتے ہیں۔

محافظ۔ ہم لوگ کوچ کر رہے ہیں۔ تم لوگ اسی وقت گولی سے اڑا دیئے جاؤ گے۔

شیوچانگ کی طرف ایک ہمدردانہ تبسم کرتا ہے)

شیوچانگ۔ (اس کے تبسم کا تبسم میں جواب دیتا ہے) آؤ چلیں۔

(چینی قیدی جاپانی سپاہیوں کی حراست میں
پابجولاں جاتے ہیں)

پردہ

دور سے گانے کی آواز آتی ہے۔

زندہ باد اے جذبۂ آزادئ جوشِ وطن
دار پر چڑھ کر بھی یہ نعرہ لگا سکتا ہوں میں

دفعتاً بندوقوں کے فائر ہوتے ہیں اور خاموشی چھا جاتی ہے۔

جوانی کی یاد

"کائیں، کائیں، کائیں۔" سامنے لنڈ منڈ نیم پر ایک کوا بول رہا تھا۔ "کھوں۔ کھوں۔ کھوں۔" کوٹھری میں بیمار جگدیش کھانس کھانس کر اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

"کھل کھل۔ کھل۔" اندر مکان میں دروازہ بند کئے جگدیش کی لڑکی سینگی نہا رہی تھی۔

باہر چھپر کے نیچے جگدیش کی بیوی مُرلی اپنے سر کی جوئیں بین رہی تھی اور کبھی کبھی اپنے سینے کا میل بھی صاف کرنے لگتی۔

"کائیں، کائیں، کائیں۔"

"کھوں۔ کھوں، کھوں۔"

"کھل، کھل، کھل۔"

مرلی یہ سب آوازیں سن رہی تھی۔ لیکن وہ ان سب سے بے خبر اپنی ایک کھوئی ہوئی چیز سامنے والے سرسوں کے کھیت میں ڈھونڈھ رہی تھی۔ سرسوں کے زرد زرد خوشنما پھول جو حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے جوانی کی سرمستیوں سے سرشار جھوم رہے تھے اور گلے مل رہے تھے اور مرلی کو منہ چڑا چڑا کر یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے "دیکھو ہم جوان ہیں۔ ہمارا جوبن تو دیکھو اور تم بڈھی ہو چکیں!" اور مرلی کی حسرت زدہ نظریں بھیک مانگ رہی تھیں۔ وہ للٹہ اپنی جوانی

میں سے تھوڑی ہم کو بھی دیدو۔ ہم بھی کبھی جوان تھے اور تمھاری ہی طرح سرمستیوں سے سرشار۔"

للتو کہار جو گاؤں بھر میں سب سے زیادہ بدمعاش مشہور تھا، اوٹ پٹانگ تانیں لگاتا ہوا سڑک پر سے گزرا۔

چھوٹی نہ بھوبالما!!

مورا جوبن تو دیکھو!!

مُرلی کو دیکھ کر وہ رک گیا اور اپنے چکی کے پاٹ ایسے سینے کے گندے اور گنجان بالوں میں اپنی انگلیوں سے خلال کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔" کہیو مہارانی۔ آج چپ کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں۔ آج ان کو کھانسی بہت آرہی تھی۔"

"کھوں۔ کھوں۔ کھوں۔" جگدیش برابر کھانس رہا تھا۔ اور "تھو۔ تھو۔ تھو۔" منہ سے بلغم کے گولے نکال کر تھوک رہا تھا۔

"ارے وہ تو پانچ چھ برس سے پڑا ہے۔ اس کے پیچھے تم کیوں اپنی جوانی تباہ کئے دیتی ہو۔" للتو نے کہا۔

"کیا کروں بھیا! اپنی اپنی قسمت۔"

"کبھی شیشہ میں اپنا منہ تو دیکھو۔ اب بھی وہ رنگ روپ اور چکناہٹ........"

للتو یہیں تک کہنے پایا تھا کہ مُرلی نے اسے ڈپٹ دیا۔ "چپ! وہی بدمعاشی کی باتیں۔"

للتو چلا گیا ہنستا اور تانیں لگاتا ہوا۔ گاؤں بھر میں وہ چھیلا مشہور تھا اور اپنی اس شہرت کی بناء پر اسے حق حاصل تھا کہ وہ جس عورت سے چاہے مذاق کرے اور اس کی بات گدھے کی لات تھی۔ کوئی برا نہ مانتا۔

مُرلی کا ہاتھ اس کے سر سے پھسل کر اس کے گالوں پر آگیا۔ واقعی وہ ابھی تک چکنے

تھے۔ شاید ایک کھٹمل نے اس کی ران میں کاٹ لیا اور وہ جلدی جلدی کھجلانے لگی۔

"کھوں۔ کھوں" جگدیش برابر کھانس رہا تھا۔

"کیسا پاجی ہے یہ للتوا" مُرلی بڑبڑائی لیکن دل ہی دل میں اس کا جی چاہتا کہ وہ مل جائے تو اس کا منہ چوم لے۔

ایشری ایک پنچی دبائے ہوئے مٹکتی نکلی۔ آج اس نے زرد ساری پہنی تھی اور خود بخود اپنی جھانجھ بجا رہی تھی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی مُرلی جل بھُن کر کباب ہو گئی۔

"کہاں چلیں؟"

"کھانا دینے جا رہی ہوں کھیت پر" ایشری نے مسکرا کر کہا۔

"آج تو بڑا نکھار ہے؟"

"کل ہی یہ ساری لادی ہے بازار سے، کہتے ہیں مجھے میلے کچیلے کپڑے اچھے نہیں لگتے"

ایشری چلی گئی لیکن مُرلی کے سینے پر ایک موگری سی پڑی۔ یہ کمبخت تیلن ابھی تک اپنے آپ کو جوان سمجھتی — یہ مُرلی سے پانچ چھ سال بڑی تھی۔ مُرلی نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر اپنے دل کو سمجھایا۔ "عورت کی جوانی تو اس کے مرد پر ہے"

"کھوں۔ کھوں۔ کھوں۔ کھوں" جگدیش پانچ دفعہ کھانسا اور اس نے مُرلی کو یاد دلا دیا کہ وہ پانچ سال سے اپنی بیوی کو بیوہ کر چکا اور اس کی جوانی کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔

پینی اب تک نہا کر نہیں نکلی تھی۔ مُرلی بلبلا کر اٹھ بیٹھی اور کنڈی کھٹکھٹا کر چیخنے لگی۔ "ارے نکل! کب تک پانی لنڈھاتی رہے گی۔ کیا مر گئی؟ گھر کا کچھ کام

دھندا ہے کہ نہیں؟"

"آتی ہوں ماں۔"

"آتی ہوں کی بچی! چل دو گھڑے پانی رکھدے میں بھی ذرا نہا ڈالوں۔"

"بس کپڑے بدل لوں۔"

"آج کل کی چھوکری! کہیں کنواری لڑکیاں اتنی دیر تک نہاتی ہیں۔" مُرلی بڑبڑاتی ہوئی پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

"کنواری لڑکی!" ان دو الفاظ نے پھر مُرلی کو خیالات کے سمندر میں ڈھکیل دیا اور اس پر ایک نئی دنیا کے دروازے کھل گئے۔ کنواری لڑکی۔ کنوارپنہ۔ چھُپ چھُپ کر شادی کی باتیں۔ دلاور۔ ننھا۔ کلو۔ گردین۔ باتیں اور گھاتیں۔ سنسان ویرانے اور باغ۔ ارہر کے کھیت!! اُسے چاندنی کی ملاقاتیں۔ اندھیری راتیں۔ خوف اور دہشت پر لطف سسکیاں!!

کھٹ سے دروازے کی کنڈی کھلی اور چھم چھم کرتی سُنتی ماں کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ تیرہ چودہ سال کا سن اور ہندستان کے ضرورت سے زیادہ گرم آفتاب میں گدرائی ہوئی سُنتی اب مکمل عورت ہو چکی تھی اور اس کا احساس اس کی ماں کو آج پہلی دفعہ ہوا۔ ماں نے اس کی طرف دیکھا اس طرح جس طرح کہ اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا اور جوانی کے رعب سے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

"کیا کر رہی تھی اتنی دیر تک۔"

"نہا رہی تھی۔" سُنتی نے ٹھنک کر کہا۔

مُرلی کو وہ دن یاد آئے جب وہ بھی کبھی خوب جی بھر بھر کر نہاتی لیکن جگدیش کی

کھوں۔ کھوں نے اسے سوچنے کا موقع نہ دیا۔

"جاؤ، گھڑے رکھ دے میں بھی نہا ڈالوں۔"

"تم ہی رکھ لو۔" کہتے ہوئے سینی ناچ کر گھوم گئی، اس کے بھیگے ہوئے بال اس کی پیٹھ سے کمر تک سرپل کھا رہے تھے۔ "دیکھو ابھی بال ہی نہیں سوکھے پھر کنگھی کرنا ہے۔"

"بڑی کام چور ہو گئی ہے تو! ارے تو جوان میں بڈھی جلدی سے کھینچ کر رکھ دے۔" مرلی نے کہا۔

"کون کہتا ہے تم کو بڈھی۔ مجھ سے زیادہ مضبوط ہیں تمھارے ہاتھ پاؤں۔ بالکل میری بڑی بہن معلوم ہوتی ہو۔" سینی نے منہ بنا کر کہا۔

مرلی اس جواب سے خوش ہو گئی اور ایک دم سے اس کے جسم میں چستی اور جوانی کی لہر دوڑ گئی اور وہ اٹھ بیٹھی۔

"کھوں، کھوں، کھوں۔" جگدیش کھانس رہا تھا۔

"اچھا جا۔ اپنے باپ کے منہ میں پانی ڈال دے، میں خود پانی بھر لوں گی۔ آج کل کی لڑکیوں کے نخرے تو دیکھو!" مرلی نے کہا اور پانی بھرنے چلی گئی۔

مرلی نہا کر نکلی تو وہ چیز ہی دوسری تھی۔ معلوم ہوتا جیسے اس نے اپنے سارے دلدّر دھو ڈالے۔ پنچ رنگا دوپٹہ، سرخ تول کی چست انگیا۔ بوٹی دار چھینٹ کا لہنگا۔ بالوں میں تیل اور مانگ اور ماتھے پر سیندور کی بندی۔

"ارے ذرا کاجل لا دے!" مرلی نے سینی کو پکارا۔ سینی کاجل لئے دوڑتی ہوئی آئی اور ماں کے ٹھاٹ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ "اماں کہیں بارات میں جاؤ گی؟ میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

"بارات میں کہاں جاؤں گی؟"

"پھر ایسے اچھے اچھے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں۔ اماں تم بڑی سندر معلوم ہوتی ہو۔ اب ایسے ہی کپڑے پہنے رہا کرو۔" بینی وفورِ محبت سے ماں سے چمٹ گئی۔

"تو تو نظر لگائے گی بھگوان!" مرلی حد سے زیادہ مسرور تھی۔

"اماں چلو بابا کو دکھا دو یہ کپڑے۔"

"کھوں۔ کھوں۔" جگدیش نے اپنی کھانسی سے ان دونوں کو یاد دلا دیا کہ ابھی اس کے مردہ جسم میں چند سانسوں یا چند کھانسیوں کی گنجائش باقی ہے۔ بیٹی کی فرمائش پر ماں نے منہ چڑا دیا۔ آج اس کے دل میں کچھ اور ہی امنگ تھی۔ جوانی کا بجھتا ہوا شعلہ ایک دفعہ پھر بھڑک اٹھا تھا جو جگدیش ایسے خاکستر سے بالکل ہی غیر متعلق تھا۔

مرلی گھر سے باہر نکلی تو بینی سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ ماں کو بیٹی کی یہ بات سخت ناگوار تھی۔ لیکن کیا کرتی۔ بیٹی بھی بڑی ضدی تھی۔ کلو بنیے نے ان دونوں کو دیکھ کر آنکھیں مٹکائیں "اے آج تو غضب ڈھا رہی ہو بہن مرلی۔" وہ بات کر رہا تھا ماں سے لیکن اس کی نظر تھی لڑکی پر۔ مرلی نے بینی کو جھنجھوڑ کر کہا "ارے جاتی کیوں نہیں ہے گھر۔ آٹا گوندھ ڈال اور آلو ابالنے کو چڑھا دے۔" لیکن بینی صرف ٹھٹک کر رہ گئی۔ سندر بزاز نے ماں بیٹیوں کا جوڑا دیکھ کر سر ہلایا۔ "ارے کہاں چلیں لالائن آج کیا ارادے ہیں؟" لیکن وہ بھی بینی ہی کو تک رہا تھا۔ جگناتھ حلوائی نے مرلی کو آواز لگائی۔ "ارے دوں آج لڈو۔ برفی۔" اور یہ کہہ کر ایک دونا بینی کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

مرلی اسی طرح چاروں طرف سے اپنا خراج تحسین لیتی ہوئی گیندا لالائن کے دروازہ

پر پہونچ گئی اور وہیں چوارا ہے پر اپنی میزبان کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ آج سڑک پر جو کوئی نکلتا اس کی طرف گھورتا اور مسکراتا اور اندر ہی اندر مرلی مارے غرور کے اینٹھی جاتی۔ باتیں تو وہ کرتی گیندا سے لیکن اس کی نظر رہتی راہ چلتوں پر۔ بس ایک سینی سے اسے کھٹکا لگا ہوا تھا جو اس کے مال غنیمت میں سے آدھے سے زیادہ تقسیم کرا لیتی۔ تھوڑی دیر بعد سینی اٹھ کر چلی گئی اور مرلی نے بڑے اطمینان کا سانس لیا اب جو کچھ تھا مرلی کا تھا۔

جس طرح مفلس کا قہقہہ بہت جلد اس کی مایوسیوں میں ختم ہو جاتا ہے اسی طرح مرلی کے بناؤ سنگار کا دن بھی شام کی بڑھتی ہوئی تاریکیوں میں گم ہو گیا۔ چند گھنٹوں میں تماشہ ختم ہو گیا اور ایک تھکے ہوئے ایکٹر کی طرح مرلی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ دن کی روشنی کے ساتھ مرلی کی جوانی بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور وہ پھر ایک پینتیس سال کی ادھیڑ عورت اور ایک تپ دق کے مریض کی بیوی رہ گئی۔ خوابوں کی دنیا اجڑتے دیر نہیں لگتی۔

مرلی نے جیسے ہی اپنے چھپر میں قدم رکھا جگدیش کی "کھوں۔ کھوں۔" نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ اور وہ سمجھ گئی کہ اب وہ اپنے گھر میں آ گئی۔ اندر مکان میں اسے کسی غیر شخص کی آہٹ معلوم ہوئی اور وہ کھمبے کی آڑ سے جھانکنے لگی۔ سامنے سینی چولھے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے پاس دیودت کھڑا بڑے رازدارانہ لہجہ میں کہہ رہا تھا "بس جیسے ہی ماتا جی سو جائیں تم کنڈی کھول دینا اور وہیں انگنائی میں لیٹ رہنا۔ میں آ جاؤں گا۔" سینی کچھ نہ بولی اور بدستور روٹی سینکتی رہی۔ دیودت پھر بولا "سینی! تجھ بن تو مجھے دنیا کا کوئی مزا نہیں، بس کہیں بھاگ نہ چلیں ہم تم۔"

"میں کہاں جاؤں گی!"

"میرے ساتھ۔"

سینی پھر چپ رہی اور اس کی اس خاموشی نے مرلی کو جیسے دھکا سا دے دیا اور وہ سامنے آگئی۔ دیودت اور سینی دونوں بوکھلا گئے۔ مرلی نے گرج کر دیودت سے پوچھا۔

"اندر کیسے آئے تم۔"

"چاچا کو دیکھنے آگیا تھا اس وقت۔ ابھی ابھی کام پر سے چھٹی ملی۔" یہ کہتا ہوا دیودت تو جلدی سے چلا گیا۔ لیکن سینی کی خیر نہ رہی۔ مرلی نے پہلے تو اُسے سینکڑوں گالیاں اور کوسنے دیئے اور جب اس سے بھی دل کی بھڑاس نہ نکلی تو ایک ڈنڈا لیکر لگی اس کو مارنے اور اس وقت تک برابر مارتی رہی جب تک کہ خود اس کے ہاتھ پاؤں شل نہیں ہو گئے۔

"اسی دن کے لئے پالا تھا تجھے حرامزادی، ناک کاٹ لی تو نے خاندان بھر کی۔ کیا منہ دکھاؤں میں کسی کو۔ بالشت بھر کی چھوکری اور یہ گن۔ سینہ پر مونگ دلتی ہے تُو۔ پاپن! جا نکل ابھی گھر سے۔ یہ تیری ہی نحوست سے سارے گھر کو چھوت لگ گئی ہے۔" وہ بار بار بڑبڑاتی جاتی۔ سینی لاکھ روئی پیٹی۔ بلبلائی گڑگڑائی لیکن اس کی کوئی سنوائی نہیں ہوئی اور بالآخر جب انتقام لینے کا کوئی دوسرا طریقہ باقی نہیں رہا تو مرلی نے اس کی چوٹی پکڑ کر اس کو گھسیٹتے ہوئے بھوسے کی کوٹھری میں بند کر دیا۔

مرلی نے دیودت اور سینی کا قصہ خوب نمک مرچ لگا کر جگدیش سے بیان کیا۔ لیکن وہ بیچارہ کچھ نہ بولا اور صرف "کھوں۔ کھوں۔" کر کر کے اپنے پاس والی دیوار پر بلغم کے گولوں سے چاند ماری کیا کیا۔ مرلی غصہ میں تو بھری ہی ہوئی تھی اس نے جگدیش کو بھی خوب جلی کٹی سنائیں۔ "تم ہی آج گت کے ہوتے تو یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا۔ بے باپ کی لڑکی پر کون ہاتھ رکھے۔ ماری ماری پھرتی ہے جب کا جس طرح جی چاہتا ہے

ہلاتا پھسلاتا ہے اس سے تو یہی اچھا تھا کہ میں بیوہ ہوتی۔ جہاں سینگ سماتا چلی تو جاتی! عزت آبرو تو باقی رہ جاتی ۔"

رات آدھی کے قریب جا چکی تھی۔ ہر طرف ہُو کا عالم اور گھراٹا تھا۔ صرف کہیں کہیں کتے بھونک رہے تھے۔ یا پھر جگدیش "کھوں۔ کھوں" کر رہا تھا۔ بھوسے کی کوٹھری سے اب پپی کے رونے کی بھی آواز نہیں آتی۔ مُرلی اپنی چارپائی پر چپ اور ساکت لیٹی شاید تاروں کو گننے کی کوشش کر رہی تھی، آسمان پر ایک بہت روشن تارہ ٹوٹا اور آسمان پر ایک سنہرا محراب بناتا ہوا خضا میں تحلیل ہو گیا، بالکل اسی طرح جس طرح کہ مُرلی بھی کہ اس کی جوانی چند پر جوش دنوں اور رومان انگیز راتوں کی دھندلی سی یاد چھوڑتی ہوئی جگدیش کی "کھوں۔ کھوں" میں غائب ہو گئی۔ پھیکی چاندنی نے مُرلی کا دل اور بھی پھیکا کر دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کی لمبی لمبی گھنی پلکوں پر دو آنسو تڑپنے لگے معلوم ہوتا جیسے اس کی بھوکی آتما کا نچوڑ یہی دو آنسو ہیں!

مُرلی، نہ معلوم کتنی دیر تک اس حالت میں پڑی رہی لیکن پھر دفعتاً وہ چارپائی سے اٹھ کر چلنے لگی بالکل اسی طرح جیسے وہ عالم خواب میں چل رہی ہو۔ وہ دھیرے دھیرے گئی اور اس نے دروازہ کی کنڈی کھول دی اور پھر وہیں انگنائی میں لیٹ رہی اور بے خبر سو گئی۔

صبح سویرے مُرلی کی آنکھ کھلی تو وہ یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئی کہ وہ انگنائی میں زمین پڑی ہے اور دروازہ کی کنڈی کھلی ہوئی ہے، وہ اس طرح کود کر بھاگی جیسے کوئی بڑی داڑھی والا مولوی غلطی سے شراب خانہ میں آ جائے اور پھر سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ "کھوں۔ کھوں" جگدیش کھانس رہا تھا اور مُرلی کو معلوم ہوتا جیسے کہہ رہا!

ہے "میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔"

ایک روٹی

کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ فلسفی ہونے کے لئے صرف فلسفی ہونا ہی کافی ہے۔ عموماً فلسفی مادرزاد فلسفی ہوتے ہیں۔ ان کے لئے عمر کی قید ہے نہ تجربہ کی نہ تعلیم کی اور نہ بے حد عقل کی۔ ہر وہ شخص جو مسائل زندگی کو ذرا گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کرے فلسفی ہے۔ حتیٰ کہ آپ نے فلسفی مرغا بھی سنا ہوگا۔ جو مرغا اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر ذرا سوچتا رہتا ہے لوگ اسے بھی فلسفی کہہ دیتے ہیں۔ خیر قصہ کوتاہ ہمارے مرزا نادر حسین بھی فلسفی تھے اور بہت عجیب قسم کے۔ علم تو ان کا گھر سے مکتب ہی تک تھا۔ لیکن تجربہ کا میدان اس قدر وسیع تھا کہ مسائل حیات و ممات کی شاید ہی کوئی ایسی وسعت ہو جو اس میں سما نہ سکے۔ مرزا صاحب اکثر مغلوب الفلسفہ ہو جاتے اور پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ٹکٹکی باندھ کر کچھ اس محویت سے سوچتے کہ پلک تک نہ جھپکتی۔ بت کی طرح بالکل ہی جامد و بے حرکت رہ جاتے۔ کئی دفعہ ان کی اس حالت پر ان کی بیوی یہ کہتی ہوئی دوڑ پڑیں "ہائے سکتہ ہو گیا ان کو" اور بیچارے مرزا کو بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

مرزا صاحب کے ذہنی خلجان میں اضافہ کرنے کے لئے بدقسمتی سے ان پر ایک اور مصیبت بھی نازل تھی یعنی وہ نہ صرف فلسفی تھے بلکہ لیڈر بھی۔ مرزا ایک وقت سوچتے

بھی اور عمل کرنے کی بھی کوشش کرتے اور اس دنیا میں جہاں ایک انسان صرف ایک کام کرتا ہے مرزا کے یہ دوہرے فرائض ان کے اختلاج قلب اور ضعف معدہ کا باعث تھے۔ مرزا ان کام چور لوگوں میں سے نہ تھے جو صرف فلسفہ کی گتھیاں سلجھاتے اور افیم کی گولیاں کھا کر گھر میں پڑے رہتے، بلکہ مرزا ان بلند ہمت انسانوں میں سے تھے جو نہ صرف فلسفہ کے بال کی کھال نکال لیتے بلکہ اس کھال کو خود بھی اوڑھتے اور دوسروں کے سر پر بھی منڈھنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ مرزا پانامالہ کے میدان میں انسداد گداگری کے موضوع پر نہایت فصیح اور بلیغ تقریر فرما چکے تھے۔ حاجی ننھو کے یہاں برزخ کے مسئلہ پر روشنی ڈال چکے تھے۔ عین امین آباد پارک میں عدم تشدد کی دھجیاں اڑا چکے تھے۔ مسٹر جناح، مہاتما گاندھی اور علامہ مشرقی سے خط و کتابت کر چکے تھے۔ 'جوانی دیوانی' کے رسالہ میں ہندستانیوں کو باہمی اتحاد کی تلقین فرما چکے تھے۔ کلن نان بائی کی دوکان پر مدح صحابہ کے سلسلہ میں مناظرہ منعقد کر چکے تھے وغیرہ وغیرہ۔ دوپہر کو مرزا سوچتے اور شام کو جس نتیجہ پر پہونچتے عوام میں اس کی اشاعت کرتے۔ صحیح معنوں میں مرزا فلسفی باعمل تھے۔

جس طرح شراب جتنی زیادہ پرانی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ نشہ آور ہوتی ہے اسی طرح فلسفہ جتنا زیادہ پختہ ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ دور رس ہوتا ہے۔ مرزا کا فلسفہ بھی اپنے ابتدائی مدارج طے کر کے روز بروز زیادہ سے زیادہ باریک بین ہوتا چلا گیا۔ پہلے تو مرزا اپنے اور اپنے اہل محلہ کے اور زیادہ تر اہل شہر کے مسائل پر غور و فکر کیا کرتے لیکن رفتہ رفتہ ایک وہ دن بھی آیا جب مرزا کو ساری دنیا کی فلاح اور بہبود کی فکر لاحق ہو گئی اور مرزا کوئی ایسا راستہ ڈھونڈھنے لگے جس پر خود چل کر اور دوسروں

کو ہاتک کردہ تمام بنی نوع انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امن اور صلح اور خوشحالی سے ہمکنار کر سکتے ۔۔۔ جوئیندہ یابندہ کے مصداق بڑی زبردست ذہنی معرکہ آرائیوں اور تدبر اور تفکر کے بے تھاہ سمندر میں بے انتہا غوطہ زنی کے بعد بالآخر مرزا اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے اور انھوں نے سوسائٹی کی تمام بیماریوں اور پریشانیوں کا ایک مجرب نسخہ دریافت کر لیا اور یہ نسخہ ع

فکر ہر کس بقدر ہمتِ اوست

کی بہترین تفسیر تھا۔

مرزا نے فوراً ایک انجمن فلاح و بہبودِ عالم قائم کر دی اور اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل رکھے۔

(۱) دنیا سے تمام جرائم اور اگر ہو سکے تو جرائم پیشہ بہ جبر فنا کر دیے جائیں۔

(۲) ہر شخص کو کام کرنے پر مجبور کیا جائے اور بیکاروں کو پھانسی دیدی جائے۔

(۳) بھیک مانگنا سنگین ترین جرم قرار دیا جائے۔

(۴) عورتیں بے پردہ ہو جائیں اور شادی کی رسم بردہ فروشی کی رسم کی طرح یک قلم مٹا دی جائے۔

(۵) تمام مذاہب کی ایک کانفرنس منعقد کر کے سب مذاہب کا معجون مرکب ایک مذہب بنا دیا جائے۔ انفرادی حیثیت سے ہر مذہب فنا کر دیا جائے اور اس کی تمام کتابیں نذرِ آتش اور اس کے مبلغین کو غرق آب کر دیا جائے۔

ان اغراض و مقاصد میں مرزا کی کیا کیا مصلحتیں پوشیدہ تھیں یہ صرف مرزا جانتے لیکن اس انجمن کی مقبولیت اس سے ظاہر تھی اگر اس کے قیام کے ایک ہی ہفتہ میں اس

کے پانچ رکن ہو گئے۔ مرزا صاحب خود، ان کے سالے کپتان نواب۔ کلو نان بائی خوشی واجد حسین کاذب اور راقم الحروف۔

انجمن فلاح وبہبود عالم کے قیام کا آٹھواں دن تھا۔ شام کے وقت مرزا صاحب اس کے متعلق بڑے سائز کے اجلی پوسٹر مطبع سے تازہ دم لئے اور بغل میں دبائے قدم بڑھاتے قصائی باڑہ سے اپنے مکان لال کنوئیں جارہے تھے۔ کلو نان بائی نے اپنی دکان سے ان کو دیکھتے ہی آواز لگائی "مرزا صاحب! کہاں تشریف لئے جارہے ہیں؟ اے ذرا دم تو لے لیجئے۔ آپ کے سر کی قسم حقہ بڑے مزے میں آرہا ہے"

مرزا صاحب کو کلو کی یہ مداخلت بیجا کچھ ناگوار گزری لیکن کیا کرتے وہ ان کی انجمن کا اسسٹنٹ سکریٹری بھی تھا۔ مجبوراً اس کی دکان پر آکر بیٹھ گئے اور تازہ تازہ روٹیوں کی خوشبو سونگھنے لگے۔ "کیا بتاؤں آج سارا دن مطبع میں پریشان رہا۔ منیجر کے سر پر بیٹھ کر یہ پوسٹر چھپائے ہیں۔ اب کل ہی ان کو سارے شہر میں چسپاں ہو جانا چاہیئے" مرزا صاحب نے کہا۔

کلو نان بائی نے پوسٹروں کا پلندہ مرزا صاحب کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کو کھول کر ایک پوسٹر باآواز بلند پڑھنے لگا۔

ایک تیس بتیس سال کی بڈھی بدصورت فقیرن جس کے منہ سے بھیک آواز بھی نہ نکلتی، آئی اور دکان کے سامنے کھڑے ہو کر تنور سے گرم گرم روٹیوں کے نکلنے کا تماشہ بڑی حریص نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"بھیک مانگتی ہے" انجمن فلاح وبہبود عالم کے صدر یعنی مرزا صاحب نے

گرج کر پوچھا۔

"اور کیا کروں؟ اللہ بھلا کرے۔" فقیرن نے کہا۔ وہ اپنی شکل و صورت سے قبرستان کے مُردوں کو بھی شرما دیتی۔

مرزا صاحب تو کچھ چپ سے ہو گئے لیکن کلو نے جھڑک کر کہا۔ "چل! چل! آگے چل! آج باسی روٹی بالکل نہیں ہے۔"

"بڑی بھوک لگی ہے بابا۔"

"تو کیا میں کچھ ٹھیکیدار ہوں تیرا۔"

"کل شام سے نہیں پایا ہے کچھ۔" فقیرن نے پھر سوال کیا۔

اس دفعہ کلو کو غصہ آ گیا اور اس نے دو تین بہت سخت گالیاں دیں۔ "حرامزادی کمینی! کچھ رکھا گئے تھے تمھارے باپ ہمارے پاس۔ روٹی نکلی نہیں تنور سے کہ یہ سور کے بچے بھیک منگے آ کر بھنکنے لگے مکھیوں کی طرح۔ اور پھر کہدو کہ جاؤ تو ہٹتے نہیں۔ اتار کر پچاس جوتے مارے ساری ڈھٹائی رکھی رہ جائے۔"

فقیرن مایوس ہو کر ایک طرف کونے میں دکان سے کچھ فاصلہ پر کھڑی ہو گئی۔ دفعتاً پچھم کی جانب گلی کی نکڑ سے ایک شور و غوغا بلند ہوا جیسے کسی گھر میں آگ لگ گئی ہو اور لوگ چیخ رہے ہوں۔ مرزا صاحب اور کلو نان بائی اور اس کی دکان پر دو تین کام کرنے والے دوڑ پڑے۔ فقیرن بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لی۔

برجموہن بنیئے کی دوکان پر ایک مجمع لگا ہوا تھا اور مجمع کے درمیان ایک بھینسے کا ٹھیلہ کھڑا تھا جس پر گیہوں کی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ اور پاس ہی زمین پر ایک بورا پھٹا ہوا پڑا تھا اور اس میں سے نکلے ہوئے گیہوں بکھرے ہوئے تھے۔ برجموہن

بنیا شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا اور بھینسے کا کوڑا لئے ٹھیلہ والے کو سٹر سٹر مار رہا تھا اور ٹھیلہ والا بلبلا بلبلا کر چیخ رہا تھا اور رو رہا تھا۔ اس کے جسم سے جا بجا خون جاری تھا اور لوگ تماشا دیکھ رہے تھے۔

اچانک فقیرن بڑھی اور اپنا دامن پھیلا کر نہایت اطمینان سے گیہوں سمیٹ سمیٹ کر اس میں بھرنے لگی۔ مجمع کچھ نہ سمجھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک چیخ کے ساتھ برجموہن ٹھیلہ والے کو چھوڑ کر فقیرن کی طرف بڑھا اور اپنی بھرپور طاقت سے ایک کوڑا اس کی پیٹھ پر مارا۔ "چور۔ حرامزادی، باپ کا مال ہے۔" فقیرن کے منھ سے آواز بھی نہ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر سیدھی سیدھی لیٹ گئی۔

مرزا صاحب نے کلو نان بائی سے کہا۔ "اچھا اب میں چلا مجھے گھر پر کام ہے۔"

کلو بولا۔ "چلو میں بھی چلا یہاں تو ہر دم یہی ہوتا رہتا ہے۔"

مرزا صاحب اور کلو نان بائی پیدل کھڑے ہوئے۔ کلو کے پیر میں کچھ لنگ تھا لہذا وہ آہستہ آہستہ چلتا۔ مرزا اس سے دو چار قدم آگے بڑھ جاتے لیکن پھر اس کے انتظار میں ان کو رکنا پڑتا۔

"لینا! لینا! پکڑنا!" کلو نان بائی کی دوکان سے کسی نے پکارا اور ایک مزدور دوکان سے کوئی چیز لے کر اتر والی گلی میں بھاگا۔

"پکڑو! پکڑو! سالے کو!" کلو چیخا اور غیر اختیاری طور سے مرزا صاحب بھاگنے والے کے پیچھے دوڑ پڑے۔

"لینا! لینا! پکڑنا!" ہر طرف یہی شور تھا اور مرزا خود بھی یہی چیختے ہوئے بھاگ رہے تھے اور اپنے خیال میں قوم کی سب سے بڑی خدمت کر رہے تھے۔ مرزا سے آگے بھاگنے

والا مزدور یا چور ان سے پندرہ بیس ہی قدم کے فاصلہ پر تھا اور مرزا کو یقین کامل تھا کہ وہ اس کو ضرور گرفتار کرلیں گے۔ گلیوں سے بھاگتا ہوا چور قبرستان کے میدان میں نکل آیا اور مرزا کو اطمینان ہوگیا کہ یہاں ضرور وہ اپنے شکار کو پھانس لیں گے۔ کیوں کہ جس طرف چور بھاگ رہا تھا اس کے سامنے ایک بہت بڑا نالہ تھا اور اس کو پھاند جانا ایک امر محال تھا۔ مرزا اور چور میں چار پانچ ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا اور مرزا نے موقع کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہوئے انجمن فلاح و بہبود عالم کے پوسٹروں کا پلندہ چور کے سر پر مارا۔ نشانے نے خطا کی اور پلندہ نالہ میں جاگرا۔ لیکن چور نے ایک اینٹ سے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل گر پڑا اس کی ناک سے خون کی ایک نہر سی جاری ہوگئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ مرزا صاحب اس کو فوراً دبوچ بیٹھے اور اس کی جامہ تلاشی لینے لگے۔

چور کی مٹھی میں کلو نانبائی کی دوکان سے چرائی ہوئی خون سے تربتر ایک روٹی تھی۔ صرف ایک روٹی!

وہ چور تھا!

فریبِ نظر

پانی بڑی تیزی سے برس رہا تھا۔ بڑی بڑی بوندیں ٹین کے سائبان اور تارکول کی سڑک سے ٹکرا ٹکرا کر ایک عجیب نغمہ پیدا کر رہی تھیں۔ ساون کی پوری بہار تھی بڑے سیاہ بادلوں سے آسمان گونجا پڑا تھا ابر کی تہوں پر تہیں جمی جا رہی تھیں۔ چاروں طرف سے تاریکی گھری چلی آتی، سنسان سڑک پر بجلی کے لیمپ ٹمٹماتے نظر آتے۔ میں اپنے مکان کی دوسری منزل کے برآمدے میں بیٹھا آخری سگرٹ سلگا رہا تھا۔ پانی برس رہا تھا اور برستا ہی چلا جاتا اور اس وقت یہ خیال بھی دماغ میں نہ آتا کہ یہ کب رکے گا۔ آج کی رات افسانے کی رات تھی۔ میں بے اختیارانہ کچھ لکھنا چاہتا تھا لیکن کیا؟

میری نظریں بار بار اپنے چھوٹے سے بجلی کے منور کمرہ پر پڑتیں اور لکھنے کی میز پر جا کر جم جاتیں لیکن میں کیا لکھتا؟ دماغ میں خیالات کا اژدہام تھا جیسے باہر آسمان پہ سیاہ ابر کا۔ جس طرح باہر رہ رہ کر کوندا لپکتا اسی طرح دماغ میں رہ رہ کر کوئی خاص خیال تڑپتا لیکن پھر تاریکی تھی اور مسلسل بارش۔

کبھی کبھی میں سوچتا کہ میں کتنا اکیلا ہوں؟ ساون کی اس ارمان بھری رات میں

کتنا تنہا؟ میری زندگی کیسی ریگستان ہے جس میں کوئی چشمہ ہی نہیں، اس اجاڑ ویرانے سے میں کیسے بھاگوں اور کہاں؟ میں کیوں نہ شادی کرلوں۔ کیا میری قسمت میں نہیں کہ ساون کی ایسی مچلتی ہوئی رات میں میرا سر بھی کسی کے آغوش میں ہو۔ لیکن میرے ساتھ کون شادی کرے؟ میرے نامعلوم مستقبل کی شریک حیات کون بنے۔ میری طوفانی زندگی کی تڑپتی او بھری ہوئی موجوں میں کون معصوم بے گناہ لڑکی اپنی کمزور اور نازک کشتی چھوڑ دے؟

دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میرے پاس سگرٹ ختم ہو چکے ہیں اور عین اسی وقت ایک افسانہ کے رومانی پلاٹ سے میرا دماغ جگمگا اٹھا۔ میں اس وقت بلا سگرٹ کی مدد کے ایک لفظ بھی نہ لکھ سکتا۔ سگرٹ کی تشنگی سے میرا برا حال تھا۔ میں نے گھڑی پر جو نگاہ کی تو ابھی نو بھی نہ بجے تھے قاعدے سے تو دوکانیں کھلی ہونا چاہیئے تھیں لیکن ہر طرف تاریکی تھی اور پانی شاید اب پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے برس رہا تھا۔

کچھ بھی ہو مجھے سگرٹ لانا چاہیئے۔ یہ سوچ کر میں نے لپک کر کاندھوں پر برساتی ڈالی اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میں سمجھتا کہ یہ میری حماقت ہے لیکن ڈیڑھ گھنٹے سے ایک ہی فضا میں تنہا بیٹھے بیٹھے میں بہت زیادہ اکتا گیا تھا۔ سڑک پر ایک قدم چلنا دشوار تھا۔ بار بار میرے جوتے پانی کے گڑھوں میں پڑ پڑ کر چھپ چھپ کر رہے تھے اور باوجود برساتی کے میں خوب بھیگ رہا تھا۔ سڑک سنسان تھی بیچارے دوکان دار دوکانیں بند کئے دبکے پڑے تھے دور سے مجھے پان کی ایک دوکان دکھائی پڑی خوش قسمتی سے دوکان ابھی کھلی تھی میری ہمت بڑھ گئی اور میں لپک کر جا پہونچا "پلیئرس کی ایک ڈبیہ" میں ایک حد تک چیخ اٹھا۔

"بہت اچھا" ایک لچکدار نسوانی آواز سنائی دی۔ میں چونک پڑا۔ اپنے چہرے کو

سے پانی پونچھتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک اٹھارہ انیس سال کی خوبصورت لڑکی مسکرا رہی تھی اس نے سگرٹ کی ڈبیہ میری طرف پھینک دی اور میں نے کوشش کرتے ہوئے کہ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے مس ہو جائے۔ ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے بڑے تعجب سے روپیہ دیکھا اور کہنے لگی۔

"پیسے نہیں ہیں؟"

"نہیں" میں مبہوت کھڑا تھا۔

تو آپ پانچ ڈبیاں خرید لیجئے۔ اس کی مسکراہٹ پہلے سے بھی زیادہ شوخ ہوتی جاتی تھی۔

"نہیں! روپیہ تم رکھ لو۔"

میں چل کھڑا ہوا، لیکن پھر میں نے پلٹ کر کہا۔ "رات کو تمھاری دوکان کس وقت تک کھلی رہتی ہے؟"

"نو بجے تک" اس نے آخری دفعہ مسکراتے ہوئے کہا۔

میں گھر واپس چلا آیا۔ رات کو میں افسانہ کیا لکھتا؟ میری زندگی میں خود ایک دوسرا افسانہ شروع ہو چکا تھا۔ میں اس اُدھیڑ بن میں پڑا تھا کہ اس سگرٹ والی کی مسکراہٹ میں کیا جادو تھا جس نے یک بیک میرے دل و دماغ پر بجلی سی گرا دی تھی۔ وہ یقیناً ایک بازاری عورت تھی۔ پان کی تجارت تو اس کی ضمنی تجارت ہوگی بڑی آوارہ اور بد معاش ہوگی وہ! نیکڑوں کو تریاچر تر دکھا چکی ہوگی۔ ہزاروں کو لوٹ چکی ہوگی۔ لیکن تب بھی اس کی مسکراہٹ میں وہ کیا خاص جاذبیت تھی جس نے میرے دل میں

ایک کھٹکا سا پیدا کر دیا تھا۔ آج تک کبھی بھی کسی کی مسکراہٹ اس طرح میری رگ رگ میں نشتر بن کر نہیں چبھی تھی، میرے لئے یہ بالکل ایک نیا تجربہ تھا۔

دوسرے روز رات کو نو بجے پھر میں اسی دوکان پر سگرٹ خرید رہا تھا۔ میں بار بار حسین دوکان دار کے چہرے پر نظر یں جماتا لیکن اس میں کوئی خاص بات نظر نہ آتی تھی۔ جوانی نے اپنی پوری دولت اس پر لٹا دی تھی اور اسی لئے وہ حسین بھی کہی جا سکتی۔ لیکن یہ کوئی عجیب بات نہ تھی! لیکن پھر کیوں اس کی مسکراہٹ اس قدر بے خود اور وارفتہ کر دینے والی تھی۔ میں بار بار غور کرتا۔ اس کی مسکراہٹ میں کچھ شوخی تھی گناہ کی لگاوٹ کے ساتھ کچھ بیکسی تھی، کچھ معصومیت، کچھ التجا، میں سمجھ نہ پایا کہ وہ مسکراہٹ کیا بلا تھی لیکن بلا وہ ضرور تھی۔ میں نے اس کا نام پوچھا اس نے ہنس کر کہا "پلیرس" (Players) اسی سگرٹ کا نام جو میں نے اس سے خریدا تھا۔ میں بے اختیار ہنس پڑا، میرے اصرار پر اس نے اپنا نام بتایا "بنفشہ" نہ معلوم سچ یا جھوٹ۔

اب میرا معمول ہو گیا تھا کہ ہر رات کو نو بجے بنفشہ کی دوکان سے سگرٹ خریدتا اور وہ اپنی معنی خیز مسکراہٹ سے مجھ پر دو ایک بجلیاں گرا دیتی۔ نہیں معلوم وہ میرا کھیل تھی یا میں اس کا۔ میں لاکھ لاکھ اپنے دل کو سمجھاتا کہ وہ نہایت ادنیٰ درجہ کی کوئی بازاری عورت ہو گی جو ہر گاہک پر اسی طرح مسکراتی ہو گی لیکن پھر بھی اس کی دوکان پر میرا جانا نہ چھوٹتا۔ اس کی مسکراہٹ اس کے جسم اور اس کے ماحول سے بالکل علیحدہ ایک چیز معلوم ہوتی۔ میں اس راز کو معلوم کرنا چاہتا تھا اور اسی

لئے رفتہ رفتہ اس سے بے تکلف ہوتا گیا۔ میں اس سے جب اس کے گھر کا حال پوچھتا تو وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتی اور کچھ نہ بولتی۔ لیکن ایک روز میں نے کہہ ہی دیا "مجھے اپنے گھر کب لے چلوگی؟" وہ خلاف معمول اس سوال پر مسکرائی بھی نہیں اور خاموش ہو گئی۔

مجھے اس خیال ہی سے نفرت تھی کہ میں اس کے بازاری جسم کا خریدار بنوں لیکن ہاں میں اس کی مسکراہٹ کے راز کو زیادہ قریب سے ضرور معلوم کرنا چاہتا تھا۔

وہ میرے تحفے تو خوشی سے مسکرا کر لے لیتی لیکن جب کبھی میں اس سے اسکے گھر چلنے کے لئے کہتا تو وہ صرف مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ اب جب میں اس کی دوکان پر جاتا تو یہی سوال کرتا۔ "مجھے اپنے گھر کب لے چلوگی؟" اور وہ کچھ نہ بولتی۔

اس کی اس خاموشی سے مجھے ایک جھنجھلاہٹ سی پیدا ہو گئی اور رفتہ رفتہ اس کی طرف سے طبیعت ہٹنے لگی۔ دفعتاً میں نے اس کے یہاں آنا جانا بند کر دیا۔ پہلے روز تو میں نے دیکھا کہ اس نے میرے انتظار میں دس بجے رات تک دوکان کھلی رکھی لیکن اس کے بعد وہ نو ہی بجے دوکان بند کر کے چلی جاتی۔

میں اپنے دل میں اس کی خاموشی کی وجہ بار بار دریافت کرتا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آتی۔ کیا وہ کوئی شریف عورت تھی؟ پھر وہ اس شوخی سے پان کیوں بیچتی ہے؟ اس بے باکی سے ہر آنے جانے والے پر مسکراتی کیوں ہے؟ ممکن ہے کہ وہ چند شہدوں کے ہاتھوں پھنسی ہو اور ان کے خوف سے مجھ سے زیادہ راہ و رسم بڑھانا نہ چاہتی ہو، یہی وجہ سب سے زیادہ معقول معلوم ہوتی۔

دو ہفتہ سے میں نے اس کے یہاں آنا جانا بند کر دیا تھا۔ لیکن ایک روز میں نے تہیہ کر لیا کہ آج جب وہ دوکان بند کر کے اپنے گھر چلے گی تو میں بھی پیچھے پیچھے اس کا گھر دیکھ آؤں گا۔

جیسے ہی گھنٹہ گھر نے رات کے نو بجائے اس نے اپنی دوکان بڑھا دی۔ وہ گھر کی طرف چلی تو میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس کا گھر زیادہ دور نہ تھا وہ تنگ و تاریک میلی کچیلی، بدبودار گلیوں سے ہوتی ہوئی ایک چھوٹے سے ٹوٹے ہوئے گھر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں اپنی حماقت سے اس کے بالکل قریب جا پہونچا تھا۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پہچان گئی۔ کہنے لگی "آؤ" میں تاریکی میں دیکھ نہ سکا کہ اس کی تیوریوں پر بل تھے یا ہونٹوں پر مسکراہٹ! اس نے کواڑ کھولے اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ایک چھوٹے سے غلیظ مکان میں داخل ہو گیا۔ طاق پر ایک چندھا دیا جل رہا تھا۔

چھوٹے سے کمرہ میں دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا "یہ میرا بڈھا باپ ہے اور یہ بیمار شوہر۔ اور یہ میری چھوٹی بہن۔ بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

میں مبہوت کھڑا تھا اور مکان کے میلے کچیلے بڈھے بیمار رہنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے سوال سے چونک پڑا "کچھ نہیں کچھ نہیں۔ تم مسکراتی کیوں ہوں؟ تمھاری مسکراہٹ میں کیا جادو ہے؟" میں نے بوکھلا کر پوچھا۔ "میں مسکراتی ہوں اس لئے تاکہ میری جوان بہن کو مسکرانا نہ پڑے۔"

اس نے کمرہ کے ایک کرنے کی طرف اشارہ کیا۔

پندرہ سولہ برس کی ایک لڑکی زمین پر دبکی پڑی تھی۔

"کیوں" میں نے پوچھا۔

"آج میں مسکرا مسکرا کر تم لوگوں سے پیسہ وصول کرتی ہوں اگر میں ایسا نہ کروں تو کل میری جوان بہن کو کہیں اور مسکرانا پڑے گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ "میرا بڈھا باپ سڑک کے کسی کونے پر بھیک مانگتا ہوگا۔ اور میرا بیمار شوہر کہیں نالی میں پڑا سڑ رہا ہوگا۔" اس کی آواز بھرائی اور وہ کچھ بول نہ سکی۔

میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس جری بہادر اور خوددار عورت کے قدموں پر اپنا سر رکھ دوں۔ لیکن گھبرا سا گیا۔ میں نے جلدی سے اپنا روپیہ کا بٹوہ نکالا اور اس کے سامنے ڈال دیا۔ میں چلنے کے لئے مڑا لیکن اس نے مجھے روک لیا اور میرا بٹوہ اٹھا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "میں مسکراہٹ کی قیمت لیتی ہوں، آنسوؤں کی نہیں۔"

کل تک جسے میں ایک بازاری عورت سمجھتا تھا آج میں اپنے آپ کو اس کے سامنے اس قدر ذلیل اور شرمندہ پا رہا تھا کہ میری زبان نہ کھل سکی میں ایک لفظ بھی نہ بول پایا۔ اپنا بٹوہ میں نے جیب میں رکھ لیا اور جھپٹ کر دروازے کے باہر نکل گیا۔

بلوہ

پردھان پور میں سب ہی قسم کے لوگ تھے۔ کالے، گورے، موٹے، دُبلے مرد، عورت، بڑے، چھوٹے، ہندو، مسلمان، برہمن، اچھوت۔ لیکن قریب قریب سب کاشتکار تھے اور سب غریب، بھوکے، ننگے، جاہل، گاؤں بھر میں شاید ہی دو چار آدمی ہوں جو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتے اور پورے تن کا کپڑا پہنتے ہوں، گاؤں کی غریبی کی وجہ سے گاؤں میں جو ایک آدھ دُکاندار یا کوئی دوسرا پیشہ کرنے والے تھے وہ بھی پریشان حال تھے اور کاشتکاروں کی مصیبتوں میں شریک۔ گاؤں کے دو زمیندار تھے مولوی مرحوم علی شاہ صاحب اور پنڈت کاشی نرائن صاحب، دونوں اپنے بال بچوں سمیت گاؤں ہی میں رہتے۔ دونوں گہرے دوست تھے اور آپس میں خوب گاڑھی چھنتی۔ کاشتکاروں سے لگان کی وصولیابی میں ایک دوسرے کی خوب مدد کرتے رہتے۔ اور اکثر تفریحاً آپس میں مقابلہ بھی کرتے اور کہتے کہ دیکھیں کس کا لگان زیادہ وصول ہوا۔ کس نے زیادہ نذرانہ اینٹھا۔ ہری بھوسہ وصول کرنے میں کون زیادہ تیز

ہے وغیرہ وغیرہ۔ بیچارے کاشتکاروں کی بُری حالت تھی۔ ایک تو لگان حد سے زیادہ دوسرے زمیندار ہر وقت بالکل سر ہی پر موجود۔ مجال کیا کہ کوئی زمیندار کسی کاشتکار کو ذرا سکھ سے دیکھ لے۔ اور فوراً لگان اور لگان نہیں تو نذرانہ کا اور نذرانہ نہیں تو ہری بھوسہ کا تقاضا نہ کر بیٹھے۔ بیگار کی تو کوئی حد ہی حساب نہ تھا۔ ہر وقت، دو چار کاشتکار ہر ایک زمیندار کی خدمت میں موجود رہتے۔ کوئی حقہ بھرتا۔ کوئی پیر دباتا۔ کوئی جھاڑو دیتا۔ کوئی جنگل سے لکڑیاں لاتا باقی داروں کو تو زمیندار اپنا خریدا ہوا غلام سمجھتے۔ جو چاہتے ان سے کام لیتے اور جب غصہ آتا بقایا وصول کرنے کے بہانے دو چار جوتے لگا دیتے۔ بیچارے بقایا دار یہ سب ظلم سہتے۔ لیکن کر ہی کیا سکتے؟ کس سے فریاد کرتے؟ اور ایک باقی داروں ہی پر کیا موقوف گاؤں بھر میں زمیندار جس کو بھی کوئی حکم دیدیتے مجال تھی کہ اس کے خلاف سر اٹھا سکتا؟

کاشتکاروں میں آپس میں بڑا میل ملاپ تھا۔ ایک دوسرے کو بھائی برادر سمجھتے چوں کہ ایک ہی ظلم اور پریشانی کے شکار تھے لہٰذا ایک دوسرے کی تکلیف کو بہت جلد محسوس کر لیتے اور جہاں تک ہو سکتا مدد کرتے۔ بیچاروں کی سیدھی سادھی زندگی تھی سویرا ہوتے ہی کھیتوں میں پہنچ جاتے اور شام تک وہیں مشغول رہتے۔ گھر آتے ہی کھانے پینے میں لگ جاتے۔ موقع پاتے تو دو چار کاشتکار رات کو ایک ساتھ بیٹھ کر ایک آدھ چلم پی لیتے۔ خالی فصل میں روزی روزگار کی فکر میں لگے رہتے۔ کبھی کبھار جب گاؤں میں شادی یا موت ہو جاتی تو تھوڑی دیر کے لئے خوشی یا غم کر لیتے ورنہ بندھی ٹکی زندگی تھی اور وہ اپنے معمول کے مطابق گزرتی رہتی۔ جاڑوں میں کچھ دن بہار رہتی رات میں جگہ جگہ الاؤ کے گرد جمگھٹ رہتے لیکن وہاں بھی شاید ہی کبھی ہنسی دل لگی

کی بات چیت ہوتی رہتی وہی پرانا دکھڑا رویا جاتا کبھی زمیندار کا، کبھی فصل کا، کبھی نہر کا کبھی پٹواری کا، کبھی بیماری کا۔ زندگی کیا تھی ایک وبال جان تھی۔

گاؤں میں کوئی چھوٹا سا واقعہ ہو جاتا تو بھی وہ بڑا زبردست سمجھا جاتا۔ ہر طرف سنسنی پھیل جاتی۔ ہر شخص اس میں دلچسپی لینے لگتا اور کئی دنوں تک گھر کی عورتوں میں اسی کا چرچا رہتا۔ ادھر چند دنوں سے گاؤں میں یہ خبر بڑے خفیہ طریقہ سے چکر لگا رہی تھی کہ "پنڈت کاشی نرائن کی نیت ٹھیک نہیں، وہ پرائی بہو بیٹیوں کو بری نظروں سے دیکھتے ہیں" لیکن چوں کہ زمیندار کا معاملہ تھا لہٰذا ہر شخص منھ کھولتے ڈرتا تھا۔ اس خبر کی اشاعت اور تائید صرف کن پھسکیوں اور اشاروں ہی سے ہوتی۔ شاید یہ بھی بات ہو کہ ابھی تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا اور یہ خبر محض قیاس اور قیافہ پر مشہور تھی۔

اب کی فصل بہت خراب تھی۔ دو مہینے سے پانی نام کو بھی نہ برسا تھا۔ ہر طرف سبزی دکھائی دینے کے بجائے دھول اڑتی نظر پڑتی۔ بیچارے کاشتکار بے حد پریشان تھے۔ وہ لوگ جو ہمیشہ سے سخت سے سخت مصیبت اور پریشانی برداشت کرتے چلے آئے تھے ان کے بھی ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ہر طرف تاریکی ہی دکھائی دیتی۔ زمینداروں کی مارپیٹ اور قرقی ڈگری کو تو اب اس وقت وہ معمولی چیز سمجھتے۔ انھیں یہی خوف کھائے جاتا کہ سال بھر تک اپنے آپ کو اور بیوی بچوں کو کیا کھلا دیں گے۔ نہر کے بل بوتے پر جو کچھ ہوا بھی تھا وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس میں کیا زمیندار کو دیتے۔ کیا کھاتے اور کیا بھسا وے کے لئے رکھ چھوڑتے۔ گاؤں بھر میں عجیب مایوسی چھائی ہوئی تھی، ہر شخص بدحواس نظر آتا اور اس پر طرہ یہ کہ زمینداروں

نے ابھی سے لگان کا تقاضہ شروع کر دیا تھا۔

ایسے خدائی قہر کے وقت کس کی حالت اچھی تھی، سب ہی پریشان تھے لیکن شیخ جمن کی حالت تو بہت ہی زیادہ قابل رحم تھی۔ بیچارے کے کھیت میں پار سال بھی کچھ پیدا نہ ہوا تھا۔ اس کا بھی لگان کل کا کل باقی تھا۔ جو کچھ گھر میں بوریا بدھنا تھا اس کو بیچ بیچ کر اس فصل کی امید پر بڑی مصیبت سے دن کاٹتے تھے۔ بال بال قرضدار تھے۔ تقاضوں کے مارے ناک میں دم تھا۔ راہ چلنا دشوار تھا۔ اور اب کی بار پوری فصل خراب ہو جانے سے تو بیچارے کی بالکل ہی لٹیا ڈوب گئی تھی۔ زمیندار اور قرضخواہوں کو تو دینے کا کیا سوال تھا۔ اب کی تو کھانے تک کو نہ تھا اور پھر بال بچے والا آدمی جانتا تھا کہ کھیت الگ نکل جائے گا۔ گھر الگ نیلام ہوگا۔ گھر گرہستی تو پہلے ہی مہاجنوں اور بنیوں کی نذر ہو چکی تھی لیکن اس کے بعد بھی تو پریشانیاں ختم نہ ہو سکیں گی۔ بیوی اور لڑکیوں کے ساتھ دربدر کہاں مارے مارے پھریں گے اور پھر کمبخت پیٹ کو کیا کریں گے؟ بیچارے کو ہر طرف مایوسی اور ذلت ہی نظر پڑتی اور اپنی بیکسی پر رو رو دیتا۔

ایک روز دن بھر مزدوری کی تلاش میں ناکام اور نامراد پھرنے کے بعد بھوکے تھکے شیخ جمن نے جیوں ہی گھر میں قدم رکھا دیکھا کہ زمیندار صاحب کے دو چپراسی بیچ انگنائی میں بیٹھے ہیں۔ بیچارے نے گھبرا کر بیوی بیٹیوں پر نگاہ کی تو وہ غریب ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھیں۔ چپراسیوں نے ان کی صورت دیکھتے ہی ڈنڈا سنبھالا "کیوں بے کہاں گھوم رہا تھا ہم دو گھنٹے سے تیرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔"

بیچارے جمن ایک تو یوں ہی جلے بھنے تھے اور پھر بیوی بیٹیوں کے سامنے اس تو تڑاق

سے شرمندہ ہونے پر اور بھی آگ بگولا ہو گئے لیکن کیا کرتے۔ کہاں جاتے؟ پھر بھی ترشی سے جواب دیا "تو تم یہاں زنانے میں گھستے کیسے چلے آئے؟"

چپراسی بھی آخر زمیندار ہی کے آدمی تھے۔ ان میں سے ایک ڈپٹ کر بولا "ابے یہ مزاج دکھانا کسی اور کو! ابھی دو چار جوتوں میں بھیجا پلپلا کر دوں گا۔"

شیخ جمن یونہی زندگی سے بیزار بیٹھے تھے۔ انہیں غصہ میں کچھ سوجھائی نہ دیا اور لپک کر ایک چپراسی کے سر پر ڈنڈا جما ہی تو دیا۔ وہ چکرا کر ایک طرف گرا اور ادھر شیخ جمن نے دوسرے چپراسی پر وار کر دیا۔ اس نے سر تو بچا لیا لیکن ڈنڈا اپنی پوری قوت سے اس کے کاندھے پر پڑا اور وہ بلبلاتا ہوا بھاگا۔

بجلی کی سرعت کے ساتھ فوراً ہی یہ خبر مشہور ہو گئی اور گاؤں بھر میں ایک قیامت آگئی۔ کہرام مچ گیا۔ تہلکہ پڑ گیا۔ آگ لگ گئی۔ جس نے بھی سنا بد حواس ہو گیا اور دوڑا، دوڑا شیخ جمن کے گھر پہونچا۔ شیخ جمن کے گھر پر ایک اژدہام لگا تھا اور ہر لحظہ انتظار تھا کہ اب زمیندار صاحب مع اپنی فوج پالٹے کے آرہے ہوں گے۔ شیخ جمن کی آنکھوں سے انگارے نکل رہے تھے اور وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح اپنے چبوترے پر ٹہل رہے تھے۔ اُن سے کوئی کچھ پوچھتا کوئی کچھ۔ مجمع میں سے ایک نے کہا "بھاگ نہ جاؤ"؟ شیخ جمن نے کچھ ایسے لہجہ میں جواب دیا کہ ان کے غصہ میں بھی بیکسی جھلک رہی تھی "بھاگ تو جاؤں لیکن بیوی بیٹیوں کو کس پر چھوڑ جاؤں اُن کو تو وہ بھیڑئے کچا ہی چبا جائیں گے۔" پھر ایک دم مجمع کی طرف پلٹ کر کہنے لگے "بھائیوں مجھے تم لوگوں سے کچھ کہنا ہے۔ پنڈت کاشی نرائن کا غصہ مجھ پر صرف اسی وجہ سے ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ مجھ سے بلا کر کہا تھا کہ دیکھو

تمھارا پار سال کا بھی لگان باقی ہے اور اب کی فصل بھی چوپٹ ہو چکی۔ بس اب یہی ایک ترکیب ہے کہ تم اپنی لڑکیوں کو میرے گھر میں اناج پچھوڑنے پر ملازم رکھا دو ان کی تنخواہ سے تمھارا لگان ادا ہو جائے گا۔ پہلے تو میں کچھ نہ سمجھا۔ جانا کہ یونہی کہہ رہے ہیں، ہوں ہاں کر کے چلا آیا لیکن جب انھوں نے روز روز بلا کر سمجھانا شروع کیا اور ہر طرف سے زور دینے لگے۔ مولوی صاحب نے بھی یہی سمجھایا اور پٹواری نے بھی یہی مشورہ دیا تو میں سمجھ گیا کہ دال میں کچھ نہ کچھ کالا ضرور ہے۔ میں نے صاف انکار کر دیا، اس پر پنڈت جی بہت بگڑے اور کہنے لگے میں ان لڑکیوں کو تیرے گھر سے گھسیٹ بلواؤں گا۔ اور آج ان کے چپراسی گھر میں گھستے چلے آئے" شیخ جمن سانس لینے کے لئے ٹھہر گئے۔ مجمع نے کچھ کہنا چاہا لیکن انھوں نے پھر سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔ "اب مجھے تو جو کچھ ہونا ہے ہو ہی جائے گا۔ اب میری بیوی اور بیٹیوں کی لاج تم لوگوں کے ہاتھ ہے۔ پنڈت رام سروپ آپ ہی گاؤں کے بڑے بوڑھے ہیں، میرے گھر والوں کا سہارا آپ ہی پر ہے۔" شیخ جمن خاموش ہو گئے اور انھوں نے بڑی حسرت سے مجمع کی طرف دیکھا۔ پنڈت رام سروپ گاؤں کے مکھیا سمجھے جاتے۔ بوڑھے آدمی تھے ہر ایک سے محبت سے پیش آتے اور اپنے آپ کو بہت لئے دئے رہتے۔ گاؤں بھر ان کی عزت کرتا اور ہر معاملہ میں اُن سے ضرور مشورہ لیا جاتا۔

شیخ جمن جب اپنی تقریر ختم کر چکے تو ہر ایک کی نظریں پنڈت رام سروپ پر پڑیں۔ پنڈت جی کہنے لگے "بھیا سارا گاؤں تمھارے دکھ میں شریک ہے۔ تمھارے گھر کی عورتیں ہماری بہن بیٹیاں ہیں۔ اُن کی لاج ہماری لاج ہے۔"

پنڈت جی نے ابھی اپنا کہنا ختم بھی نہ کیا تھا کہ کرشن کمار گاؤں کا جوشیلا نوجوان بول اٹھا "شیخ جی جو مصیبت آج تم پر ہے وہی کل ہم سب پر ہوگی۔ تم نے بڑی مردانگی کا کام کیا۔ تمھاری عورتوں کی لاج گاؤں کی لاج ہی۔ تم نے زمیندار کو منھ توڑ جواب دے کر ہم سب کی لاج بچائی ہے۔ اب ہمارا فرض ہی کہ تم کو بچائیں۔" مجمع نے ایک پھریری سی لی۔ کرشن کمار کا جوش اور بڑھ گیا۔ "اب تک ہم نے ظلم کا جواب خوشامد سے دیا اور اسی لئے ہم پر اور ظلم توڑے گئے اب تم نے ہمیں ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ کچھ بھی ہو اب ہم ظلم کا جواب خوشامد سے نہیں دے سکتے۔ ہمارا گاؤں بھر زمینداروں کے ظلموں سے پریشان ہے۔ اب ہم کیوں نہ ایکہ کر کے اس ظلم کو مٹانے کی کوشش کریں۔ یوں تو زمیندار ہر کاشتکار کو مار سکتا ہے لیکن اگر گاؤں بھر ایک ہو جاوے تو وہ کسی کاشتکار کو آنکھ بھی نہیں دکھا سکتا۔ ہم نے تمام عمر ظلم سہے ہیں۔ کیا ہم اور ہمارے بچے اسی طرح ہمیشہ ہمیشہ ظلم سہتے رہیں گے۔ اب یہ نہیں ہو سکتا۔ زمیندار کے چپراسی تمھاری عورتوں میں گھستے چلے آئے تم نے بہت اچھا کیا جو انھیں مارا۔ تم نے گاؤں کے لئے ایک مثال قائم کردی ہے۔ اب چاہے کچھ بھی ہو تمھارا بال بیکا نہیں ہو سکتا کسی کو کچھ کرنا ہو تو جاکر عدالت میں کرے۔ وہاں ہم بھی کہہ سن لیں گے۔"

کرشن کمار کی تقریر سے مجمع کی بجھی بجھی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بیچارے کاشتکار جو عمر بھر سے غریبی اور ظلم کی تاریکی میں گھسے ہوئے تھے آج انھیں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ لوگوں کے دل بڑھے ہوئے تھے دو تین آدمیوں نے گرما گرم تقریریں کیں اور تھوڑی ہی دیر میں ساری فضا بدل گئی۔ جہاں پہلے کاشتکار

ناامیدی کا جذبہ لئے کھڑا تھا۔ پر اب اس کے دل میں انتقام کا جذبہ موجیں مار رہا تھا۔ پنڈت کاشی نرائن بڑے جوش اور غصّے میں بھرے شیخ جمن کو لینے آئے لیکن کرشن کمار اور کریم بخش ایسے نوجوانوں نے الٹے ان ہی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ پنڈت جی کا مارے غصّہ کے برا حال تھا جو منھ میں آتا اول فول بک رہے تھے لیکن یہ دیکھ کر کہ آج سارا گاؤں ایک ہے، دانت پیستے مٹھیاں بھینچتے واپس چلے گئے۔

کاشتکاروں کی یہ فتح ان کی پہلی فتح تھی۔ انھیں اپنی طاقت کا احساس ہو گیا اور زمیندار کا وقار ایک دفعہ روند کر انھیں اسے بار بار روندنے کا شوق پیدا ہو گیا اور اس شوق کا اظہار اس طرح کیا گیا کہ اس فصل میں ایک کاشتکار نے بھی اپنا لگان بیباق نہیں کیا۔ زمیندار بے بس تھے کیا کرتے۔ ایک آدھ کاشتکار ہوتا تو اسے ڈرا دھمکا لیتے لیکن پورے گاؤں سے کیسے نپٹتے، رفتہ رفتہ کاشتکاروں نے اور زور پکڑا، نذرانہ بھی بند ہوا اور بیگار سے بھی چھٹی ملی۔

کئی برس گزر گئے اور اس عرصہ میں کاشتکاروں نے بار بار زمینداروں کو اس طرح پسپا کیا کہ شیخ جمن والا واقعہ بھی لوگ بھولنے لگے۔

جاڑوں کی ایک صبح کو ابھی لوگ اچھی طرح جاگے بھی نہ تھے کہ یہ خبر کسی وبائی بیماری کی طرح گاؤں بھر میں پھیل گئی کہ گاؤں کے مندر میں کسی نے ایک مری ہوئی گائے لا کر پھینک دی ہے۔ ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ بڑی تفتیش ہوئی لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ پنڈت کاشی نرائن سب سے زیادہ ناراض تھے انھوں نے

مولوی مرحوم علی شاہ کے پاس کہلا بھیجا کہ "مولوی صاحب اس کا پتہ لگوائیے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔" مولوی صاحب کیا جواب دیتے۔ کہنے لگے "میں کیا جانوں؟" سہ پہر میں انھوں نے مسلمانوں کا ایک جلسہ کیا اور انھیں پنڈت کاشی نرائن کا پیغام سنایا۔ مسلمان بہت بگڑے اور مولوی صاحب کے مشورہ سے طے کیا کہ آج سے باری باری چند مسلمان ہر رات کو مسجد کی حفاظت کیا کریں۔ ادھر پنڈت کاشی نرائن نے ہندوؤں کا ایک جلسہ کیا اور انھیں نہیں معلوم کیا کچھ سمجھایا بجھایا۔

رات کے کوئی قریب بارہ بجے ہوں گے کہ ایک غل اٹھا "چل گئی" "چل گئی" پنڈت کاشی نرائن اپنے مکان پر جگائے گئے اور مولوی مرحوم علی شاہ اپنے مکان پر معلوم ہوا کہ چند مسلمان مسجد کی حفاظت کر رہے تھے اور کچھ ہندوؤں نے اس کی پشت کی طرف سے اس میں ایک مرا ہوا سور ڈالنے کی کوشش کی۔ اس پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں لاٹھی چل گئی۔ یہ "چل گئی" کی وبا مسجد کے احاطہ تک ہی محدود نہ رہی بلکہ گاؤں کے جوشیلے نوجوانوں کی وجہ سے سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ روکنے والا کون تھا؟ لاٹھی چلی اور ایسی چلی کہ خون کی ندیاں نالے بہنے لگے۔ دونوں جماعتیں قریب قریب برابر ہی تھیں۔ کوئی کیوں دبتی؟ قتل و غارت گری عام ہو گئی۔ کسی کی جان گئی اور کسی کا گھر لٹا۔ لڑنے والے سب تھے اور روکنے والا کوئی نہیں۔ خدا خدا کرکے جب دیوانے لڑتے لڑتے تھک گئے اور جوش ذرا ٹھنڈا پڑا تو دوسرے دن کہیں بلوہ رکا۔ گاؤں بھر میں شاید ہی کوئی گھر بچا ہو جس کا کچھ نہ کچھ جان و مال کا نقصان نہ ہوا ہو، صرف دو گھر محفوظ تھے، ایک مولوی مرحوم علی شاہ کا اور دوسرے پنڈت کاشی نرائن کا جہاں آٹھ آٹھ چوکیدار پہرہ دیتے!

کے لئے موجود تھے۔

کچھ دن تو بڑے زوروں سے مسجد میں اذانیں بھی ہوئیں اور بڑے جوش سے مندر میں گھنٹہ بھی بجا لیکن پھر گاؤں میں کامل سکون اور جمود چھا گیا۔ تھوڑے دنوں میں مولوی کامرحوم علی شاہ اور پنڈت کاشی نرائن میں بھی صفائی ہوگئی اور پھر ساتھ کا اٹھنا بیٹھنا اور ہنسی مذاق شروع ہوگیا۔ گاؤں پھر اپنی بلوہ سے پیشتر والی حالت پر آگیا صرف فرق یہ ہوا کہ کاشتکار اب نذرانہ بھی دیتے اور بیگار سے بھی منہ نہیں موڑ سکتے تھے۔ شیخ جمن کی لڑکیاں پنڈت کاشی نرائن کے گھر میں ہیں اور شیخ جمن کی بیوی اور رام سروپ کی بہن اب دونوں ساتھ ساتھ بھیک مانگتی پھرتی ہیں اور اب نہ گاؤں میں شیخ جمن ہیں نہ پنڈت رام سروپ نہ کرشن کمار ہے نہ رحیم بخش۔ وہ بلوہ کی نذر ہوچکے۔ گاؤں والے کبھی کبھی ان کو یاد کر کرکے افسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "آج وہ لوگ ہوتے تو کاہے کو ہم لوگ زمینداروں کے ظلموں کے شکار ہوتے۔ ان کے ہوتے ہوئے ہم سے بیگار کون کرا سکتا، نذرانہ کون وصول کرسکتا، گالیاں کون سنا سکتا، اور مار کون سکتا ہے؟" ایک مری ہوئی گائے کی محبت اور ایک مرے ہوئے سور کی نفرت نے گاؤں کا تختہ ہی پلٹ دیا۔

جوشِ عقیدت

بڑے بوڑھوں کا مقولہ ہے کہ چاہے اللہ میاں سے نہ ڈرو لیکن ایک پولیس اور دوسرے مولوی سے ضرور ڈرو۔ ایک سے بگاڑ کیا تو دنیا خراب اور دوسرے سے بگاڑ کیا تو عقبیٰ۔ پولیس خفا ہوئی تو بم پولس کا لطف آیا۔ اور مولوی صاحب ناراض ہوئے تو جہنم کا پروانہ کٹا۔ پولیس اور مولوی کی زیادتی اور زبردستی کی کوئی داد ہے نہ فریاد۔ ایک معمولی سا کانسٹیبل چاہے تو آپ کو آدمی سے مرغا بنا دے اور ایک ٹوٹی ہوئی قبر کے مجاور کے دل میں سما جائے تو آپ پر آپ کی منکوحہ بیوی حرام قرار دیدے۔ غرضیکہ کہاں تک کہا جائے اور کس طور سے سمجھایا جائے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ دونوں خطرناک اور مخدوش ہیں اور اس بزعم خود شریف آدمی کو جس کو کہ اپنی ٹوپی اچھلوانا منظور نہ ہو۔ ان کے سائے سے دور بھاگنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ آزادی اور روشن خیالی کے آنے والے زمانہ میں اس نسل کے حملہ جانور چڑیا گھر میں بند کٹھروں میں رکھے جائیں جیسے کہ آج کل شیر اور تیندوے رکھے جاتے ہیں۔ لیکن ابھی تک یہ وقت نہیں آیا ہے

اور احتیاط لازم ہے۔

اس عافیت بینی اور عاقبت اندیشی یا بقول اپنے بزدلی اور کم ہمتی سے مرزا حیدر بیگ سخت متنفر تھے۔ ان کے بغض للہی کے لئے متنفر کا لفظ بھی بہت ہلکا ہے۔ دوسری طرح پولیس اور مولوی کے درپئے آزار تھے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ان کی زندگی کا بہت اہم مقصد یہ بھی تھا کہ وہ خدا واسطے پولیس اور مولوی کو پریشان کریں اور تکلیف پہنچائیں۔ وہ ہمیشہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے کہ جب وہ کسی اونچی مونچھ والے پولیس کے آدمی یا بہت زیادہ حلق سے بولنے والے مولوی کو نیچا دکھا سکیں ایک حد تک وہ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ ابھی مجھے ان کے محلہ میں آئے ہوئے ایک مہینہ بھی نہ گذرا تھا کہ میں بہت جلد ان کا صورت آشنا، ملاقاتی دوست، اور رازداں بنتا چلا جا رہا تھا۔

مرزا حیدر بیگ ساٹھ باسٹھ سال کے قد آور اور لحیم شحیم انسان تھے۔ چہرہ بالکل سرخ و سفید اور بہت بارعب تھا۔ آواز کی کرختگی میں خوش مزاجی سموئی ہوئی تھی۔ داڑھی قریب قریب سفید ہو چکی تھی لیکن جسم پر ضعف یا سن رسیدگی کا کوئی اثر نہ تھا۔ اپنا ڈنڈا بغل میں دبا کر بڑی آن بان سے چلتے۔ زیادہ تر اپنی وضع افغانی بنائے رہتے سر پر بڑا سا عمامہ۔ جسم پر کوٹ۔ واسکٹ اور پیروں میں بوٹ۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا صاحب کو غصہ آتا ہی نہیں۔ تھا اور بہت خونخوار قسم کا۔ لیکن محلے والوں کی خوش قسمتی سے بہت کم آتا۔ جھلاہٹ زیادہ تھی۔ عام طور سے مرزا صاحب بہت پُر لطف اور یار باش آدمی تھے۔ مذاق اور خصوصاً فحش قسم کے مذاق سے بہت خوش ہوتے۔ بات بات پر گالیاں بکتے۔ کسی سے خوش بھی ہوتے تو از راہِ محبت اس کو ماں،

بہن یا بیٹی کی گالی دیکر پکارتے

محلہ کا ہر چھوٹا بڑا مرزا صاحب کی عزت کرتا۔ اور ان کے خلاف مزاج یا خلاف شان بات کرنے کی جرائت نہ کرتا۔ مرزا صاحب کا اپنا کوئی کنبہ نہ تھا صرف بیوی اور ایک بیٹی۔ لیکن محلّہ بھر کو اپنا عزیز اور اہل برادری سمجھتے۔ ہر ایک سے شفقت سے پیش آتے اور اس کے دکھ اور درد میں شریک رہتے۔ ہمیشہ ہر ایک کا کام کرنے یا اس کا ہاتھ بٹانے میں مستعد رہتے۔ لیکن کبھی کسی سے کسی بات کے خواہشمند نہ ہوتے۔ مرزا صاحب کا دوسرا نام خودداری تھا۔ اپنی بات پر اپنی جان دیتے۔ یہ محلے میں مرزا صاحب کی ہر دلعزیزی ہی تھی جس سے کہ مرزا صاحب اپنے دیرینہ دشمنوں یعنی پولیس اور مولوی کو زیر کیے رہتے۔ اور ان کے قابو میں نہ آتے۔ ورنہ نہیں معلوم اب تک کیا کچھ نہ ہو چکا ہوتا۔ مارنے اور مرنے کے لئے مرزا صاحب ہمیشہ آمادہ رہتے۔ لیکن زیادہ تر یہ جذبہ اجنبی لوگوں ہی کے لیئے کار فرما رہتا۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ محلّہ میں کوئی مدِ مقابل تھا ہی نہیں۔ کون تھا جو ان سے سرتابی کرتا اور جسے وہ مارتے۔ اور کس کے منھ میں دانت تھے جو ان کی طرف معاندانہ طور سے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکتا۔

نماز تو مرزا صاحب پانچوں وقت کی پڑھتے اور رمضان میں بلاناغہ روزے بھی رکھتے لیکن جتنے شرعی عیب ہو سکتے ہیں وہ ان میں علی الاعلان موجود تھے۔ کسی بات میں وہ بند نہ تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہر فن مولا تھے۔ صرف اتنی بات ضرور تھی کہ کبھی کوئی حرکت خود اپنے محلہ میں نہیں کی۔ صرف اس خطہ کو چھوڑ کر سارا شہر ان کی جولانگاہ تھا۔ ہر جگہ وہ میدان مارتے لیکن اپنے محلہ میں صرف قہقہے لگاتے

اکثر کارنامے سرکرنے کے لئے ان کے قدردان اُن کو معاوضہ دے کر بھی لیجاتے۔ اور مرزا صاحب کی آمدنی کا یہ بہت بڑا ذریعہ تھا۔ ظاہری طور سے مرزا صاحب کی آمدنی کا وسیلہ ان کے چند موروثی مکانوں کا کرایہ تھا جو ان کے ہی محلہ میں واقع تھے اور جن میں سے ایک کا میں بھی کرایہ دار تھا۔

مرزا صاحب کے جملہ عادات و خصائل ان کی شان انفرادیت لئے ہوئے تھے۔ معمولی معمولی سی باتوں میں بھی۔ مثلاً حقّہ پینے میں۔ سودا خریدنے میں۔ یکّہ پر سوار ہونے میں ان کی اپنی ایک خاص ادا تھی جس کو وہ کسی موقع پر بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ مرزا صاحب کے متعلق بہت سے قصے مشہور تھے۔ جن کو وہ لطف لے لیکر بعض اوقات خود بھی سناتے۔ وہ اپنے کسی کارنامہ پر نادم یا پشیمان نہ تھے۔ بلکہ وہ اس قسم کے لوگوں میں تھے جن کو اگر ان کی گزشتہ زندگی از سرِ نو واپس دیدیجائے تو وہ پھر اس کو اسی طریقہ سے بسر کریں جیسے کہ اب تک بسر کی ہو۔ ہمیشہ جو چاہا کیا اور ایک دفعہ جو کام کر دیا پھر اس کے متعلق کبھی غور و فکر ہی نہیں کیا۔

ایک دفعہ مرزا صاحب ایک تعلقہ دار کے یہاں ملازم ہوئے۔ رکھے تو گئے تھے ضلعداری کے لئے لیکن بہت جلد اس قدر مقبول ہوئے کہ خاص مصاحبین میں سے ہو گئے۔ تعلقہ دار کی منظورِ نظر ایک طوائف تھی مرزا صاحب کی بھی اس سے نظر لڑ گئی۔ کچھ دنوں تو اس کی وساطت سے تنخواہ میں اور داد و دہش میں اضافہ ہوتا رہا لیکن بالآخر ایک دن تعلقہ دار کا حکم نادری ملا کہ وہ فوراً اپنے گھر روانہ ہو جائیں۔ اور آئندہ پھر کبھی اپنی صورت نہ دکھائیں۔ مرزا صاحب نے فوراً تعمیل ارشاد کی لیکن کس شان سے ؛ تعلقہ دار کی منظورِ نظر طوائف بھی ان کے ہمراہ

تھی۔ بعد میں بہت دفعہ بلائے گئے لیکن مرزا صاحب پھر اس تعلقہ دار کے دروازہ پر تھوکنے تک کے بھی روادار نہیں ہوئے۔

مرزا حیدر بیگ کے کمالات اور کرامات گنائے اور شمار کرائے نہیں جا سکتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ کسی تھانیدار کے ذرائع آمدنی! میں یہی کہنا کافی ہے کہ دنیا کا کون سا کام تھا جس میں مرزا صاحب کو شاطر نہ کہا جا سکتا؟ ہر کام کرتے اور ایسا کرتے کہ دیکھنے کے والے دنگ رہ جاتے۔ جس شخص نے اپنا کوئی کام ان کے سپرد کر دیا وہ بالکل محفوظ اور مطمئن ہو گیا۔ گویا کہ اس کا بیمہ ہو گیا۔ وہ زمین وہ خریدتے۔ شادی بیاہ وہ کراتے۔ اولاد ہونے کے تعویذ وہ لا دیتے۔ ضرورت پیش آ جائے تو اولاد پیدا کر دینے والا طلاء اور معجون وہ تیار کرا دیتے۔ کوئی مر جائے تو تجہیز و تکفین سے لیکر سیوم، فاتحہ حتیٰ کہ ترکہ کی تقسیم ان کے ہاتھوں ہو۔ لڑائی وہ کرائیں۔ ملاپ میں وہ پیش پیش رہیں۔ مقدمات وہ دائر کریں۔ فوجداری میں وہ شریک ہوں۔ طوائفوں کے گاہک وہ مہیا کریں —— میلاد شریف کے لئے چندہ وہ مانگیں۔ ناجائز شراب ان کی معرفت تیار کی جائے اور مسجد کی مرمت ہو تو اس کا انتظام بھی وہ ہی کریں۔ دنیا سے لے کر عقبیٰ تک وہی سب سے پیش پیش نظر آتے۔ قصہ مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ انسان کی جملہ کمزوریوں اور مجبوریوں کے باوجود اگر کسی کو قادر مطلق کہا جا سکتا تو وہ "مرزا حیدر بیگ عفی عنہ بقلم خود" تھے۔ مرزا صاحب اپنے دستخط یوں ہی کرتے جو ان کی ہر تحریری ہدایت۔ نسخہ۔ خط اور فرد حساب پر نہایت جلی اور بیباک شانِ خطاء سے ثبت ہوتے اور مہر کے نشان کی طرح معلوم ہوتے۔

مرزا صاحب کا اصل میدان طوائفوں کا چکلہ تھا اسے وہ اکثر اپنا دارالسلطنت کہتے۔ اور واقعی ٹھیک کہتے طوائفوں میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا۔ ہر طوائف ان کی مطیع اور فرمانبردار تھی۔ اور ان کی مائیں اور خالائیں اور دلال تو گویا مرزا صاحب کا کلمہ ہی پڑھتے۔ جس سے خوش ہوگئے اس کے گھر سونا برسوا دیا اور جس سے بگڑ بیٹھے اس کا ایسا منھ کالا کرایا کہ بھاگتے ہی بن پڑا۔ اس کوچہ میں وہ چالیس پینتالیس سال سے گامزن تھے اور شہر بھر میں اس کوچہ کا کوئی ایسا راہرو نہ تھا جو مرزا صاحب کے سامنے اپنا زانوئے شاگردی تہہ کرنا فخر نہ سمجھتا ہو۔ چکلہ مرزا صاحب کے محلہ کی پشت ہی پر واقع تھا۔ لہٰذا ان کے دن اور رات کا زیادہ تر حصہ یہیں گزرتا۔ کوئی ایسی طوائف نہ تھی کہ جس کی دو چار پشتوں سے مرزا صاحب واقف نہ ہوں۔ بڈھی طوائفیں جو از کار رفتہ ہو چکی تھیں مرزا صاحب کو بڑی خاطر تواضع سے ہاتھوں ہاتھ لیتیں اور ان کی پرلطف باتوں سے پرانی صحبتیں اور گزری ہوئی باتوں اور بیتی ہوئی راتوں کی یاد تازہ کرتیں اور اس حلقہ میں مرزا کی عملداری کا اصل راز ان کا غصہ یا ان کی بدمعاشی اور لفنگا پن نہ تھا بلکہ ان کا حسنِ مذاق۔ آدابِ مجلس۔ ان کی ہمدردی، محبت اور خلوص تھا۔ وہ اپنا نقش اپنے خوف یا اپنی تخریبی قوتوں سے نہیں جماتے بلکہ اپنی ہردلعزیزی اور اپنی تعمیری طاقتوں سے۔ ان کے وسائل لامحدود تھے اور ہر مرض کی دوا ان کی چٹکیوں میں تھی۔ پھر کون تھا جو اُن کو سرآنکھوں پر نہ بٹھاتا۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ہمیشہ جس سے ملے بے غرض اور بے مطلب ملے اور اگر کسی سے کوئی کام لیا تو اس کے منھ مانگے دام دیے۔ طوائفوں کے یہاں ایسے روز کے آنے والے دوسرے لوگوں میں یہ بات نہ تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ تو

مفت خورے اور دسترخوان کی مکھی کہے جاتے اور مرزا صاحب مربّی اور سرپرست۔

طوائفوں کی برادری میں افسرِ خاندان ناظمہ جان خیال کی جاتی۔ سب سے زیادہ تجربہ کار اور دولتمند وہی تھی۔ شہر میں اس کے آٹھ دس مکانات اور بیسیوں دکانیں کرایہ پر چل رہی تھیں۔ اور اس کے زیوروں کی قیمت کا اندازہ پچاس ہزار روپیہ تک کیا جاتا تھا۔ اب اس نے خود تو پیشہ چھوڑ دیا تھا اور انسانوں سے آشنائی ترک کر کے اللہ میاں سے آشنائی کر لی تھی۔ یعنی نماز، روزہ، قرآن خوانی اور وظائف میں مصروف تھی۔ لیکن اس کی لڑکیاں برسرِ اقتدار تھیں اور کئی نوا سیاں بھی زور پکڑ رہی تھیں۔ اس کے گھر میں مرزا صاحب کی بڑی آؤ بھگت تھی اور خود ناظمہ جان تو اپنے آپ کو مرزا صاحب کی زرخرید لونڈی ہی سمجھتی۔ اسکے متعلق مرزا صاحب کی سرپرستی کا عجیب وغریب قصہ مشہور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شروع شروع اب سے پچیس سال قبل وہ قصبہ سے شہر میں آئی تو اس کو کوئی ٹکے سیر بھی نہ پوچھتا اور بڑی تنگدستی اور گمنامی میں زندگی بسر ہوتی۔ اس وقت دلبر جان کی طوطی بول رہی تھی اور مرزا صاحب بھی اس کے گروہ میں شامل تھے اور اس کو اوپر اٹھا رہے تھے۔ لیکن کچھ ایسا اتفاق پیش آیا کہ مرزا صاحب کسی بات پر دلبر جان سے ناراض ہو گئے اور اس پر ان کے نہایت خوفناک قسم کے غصہ کا دورہ پڑ گیا۔ دلبر جان نے کہیں کسی سے کہہ دیا کہ "ایسے بہت دیکھے ہیں غصہ کرنے والے"۔ اس پر طیش میں آ کر مرزا صاحب نے اس کو یہ کہلا بھیجا کہ "دیکھنا ایک ٹکے کی رنڈی ناظمہ کو بھی تیرے سر پر نہ بٹھا دوں تو میں اپنے باپ کے نطفہ سے نہیں"۔ اسی روز سے مرزا صاحب نے ناظمہ کو اپنے آغوشِ سرپرستی میں

لے لیا۔ اس کو اس کے ٹوٹے اور بوسیدہ کوٹھے سے ایک شاندار سہ منزلہ مکان میں اٹھا لائے۔ بہتر سے بہتر دلال اور استاد اس کے لئے مہیا کر دئے گاہکوں کا وہ تانتا بندھا پایا کہ ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ ایک سے ایک بڑھ کر نواب، سیٹھ۔ تعلقدار۔ سے ناظمہ کے مکان کی چوکھٹ چھوادی۔ دوہی برس میں ناظمہ ناظمہ ہوگئی۔ اور دلبرجان پر ایسا دھبہ لگا کہ اس نے چکلہ چھوڑ کر مال گودام کے ایک بابو سے شادی کرلی۔

یہ طوائفوں ہی کا چکلہ تھا جہاں مرزا صاحب پولیس کے ملازموں اور مولوی صاحبان کو ذلیل وخوار کرتے جہاں ان بزرگوں میں سے کسی نے اس خطۂ پاک میں قدم رکھا اور مرزا صاحب کی مرضی لئے بغیر اپنی لازم خانی جتائی وہیں مرزا صاحب نے اپنا ڈنڈا سیدھا کیا اور ان کی خبر لی۔ جو شخص بھی پولیس اور مولوی سے لڑائی مول لیتا اس کو بغیر خواہش کے مرزا صاحب کی حمایت حاصل ہوجاتی۔ ان بزرگوں سے مرزا صاحب کی خداواسطے کی دشمنی کا شاید کوئی ماہر نفسیات بھی تجزیہ نہ کرپاتا۔ اور پھر یہ کہ خود مرزا صاحب کے والد تھانیدار تھے جو پنشن لینے کے بعد مولوی بن گئے تھے۔

مرزا صاحب کے طور اور طریقے اچھے تھے یا بُرے اس وقت یہ موضوع زیر بحث نہیں ہے اس وقت صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ مرزا صاحب نہایت سختی اور پابندی کے ساتھ اور ڈنکے کی چوٹ پر ان پر کاربند تھے۔ اپنے عادات وخصائل کے متعلق ان کا کردار لوہے کی طرح سخت تھا۔ البتہ ایک جگہ صرف اس لوہے کی سل میں تھوڑا سا لوہا غائب تھا اور اس کی جگہ موم بھرا ہوا تھا۔ مرزا صاحب اپنے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی ہستی کو بھی نہ مانتے لیکن جب ان کے مرحوم پیر شاہ عبدالمعروف ذوالنون عرف بچکن میاں صاحب کا نام آجاتا تو وہ ٹھٹھر کر رہ جاتے۔ اپنے پیر کے

نام پر دہ مٹے ہوئے تھے اور یہ نام لیکر جو شخص بھی چاہتا ان سے حسب مرضی سب کچھ کرا لیتا۔ یہ راز عام نہیں تھا لیکن جو یہ جانتا وہ مرزا صاحب سے بہت جلد ناجائز فائدے اٹھانے لگتا۔ بہت سے کام جو مرزا صاحب یوں کرنا پسند نہ کرتے محض اپنے پیر صاحب کے نام کا واسطہ آجانے سے انھوں نے کر ڈالے۔ اپنا واقعہ خود بیان کرتے کہ وہ کسی عورت کا اغوا کرنا بہت معیوب سمجھتے ہیں اور اس کام کو ایک طرح سے بزدلی تصور کرتے ہیں لیکن ایک دفعہ ان کے ایک پیر بھائی کو ضرورت پڑ گئی اور اس نے پیر صاحب کی قسم دلادی۔ بیچارے نے پیر بھائی کی تو خوب مرمت کی لیکن مجبوراً اس کی خاطر اغوا کرنا ہی پڑا۔

مارچ کا پہلا ہفتہ تھا۔ موسم نہایت خوشگوار تھا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے جاڑے اور گرمی آپس میں شادی کرکے ہنی مون منا رہے ہوں۔ میں اپنے برآمدہ میں مرزا صاحب کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ مرزا صاحب ایک آرام کرسی پر دراز حقے کے میٹھے میٹھے کش کھینچ رہے تھے۔ رات کے نو بجے ہوں گے۔ فضا میں ایک عجیب سکون تھا جو قلب کی گہرائیوں تک اترتا ہوا معلوم ہوتا۔ باتیں کرتے کرتے ہم لوگ دیر ہوئی تھک چکے تھے اور اب بالکل خاموش تھے۔ باہر بیٹھک میں آہٹ ہوئی اور ایک طنزیہ "سلام علیکم" کے ساتھ بھائی ارشد نمودار ہوئے۔ مرزا صاحب کو دیکھتے ہی دوڑ پڑے اور بری طرح چمٹ گئے۔ "استاد آپ کو ڈھونڈھتے ڈھونڈتے سارا شہر چھان مارا اور آپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔"

"کیوں خیریت تم تو ایک مدت سے دکھائی ہی نہیں پڑے ابھی پرسوں ہی میں ارشد میاں سے تم کو پوچھ رہا تھا۔"

"ارے صاحب۔ میں گیا چولھے بھاڑ میں۔ آپ کے دارالسلطنت میں بہت زبردست بغاوت ہوگئی ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟ آخر کچھ بتاؤ تو بھی۔ میرا دارالسلطنت اور بغاوت؟ کیوں نہ ہو جب تمہارے ایسے ناکارہ وزیر ہوں تو جو کچھ بھی نہ ہو جائے تھوڑا ہے۔" مرزا صاحب نے کہا۔

"مرزا صاحب۔ آپ کی جان کی قسم بڑا غضب ہوگیا۔ بت خانے کے سارے پرانے بت کان پکڑ کر نکال دئیے گئے۔ اور ان سب کی جگہ ایک بُت نوخیز لے لی ہے۔"

"تو آخر تعجب کیا ہے؟ پرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزیں لیا ہی کرتی ہیں۔ تمہارا مطلب شاید یہ نہیں۔ ہے کہ جو ابھی ایک ہفتہ ہوا مرشد آباد سے آئی ہے۔"

"مرزا صاحب خوب چیز ہے۔ بس کیا بتاؤں۔ پٹاخہ ہے بالکل پٹاخہ۔" ارشد نے ندیدوں کی طرح کہا۔

"بھئی میرے ملاحظہ سے تو وہ ابھی گزری نہیں۔ یہ استاد کئی دفعہ مجھے بلانے بھی آئے۔ یہ بھی پیغام آیا کہ اگر حکم ہو تو وہ خود میرے یہاں آئے لیکن تمہیں معلوم ہے کہ میں یہ مجہول کبھی نہیں پالتا۔ میں نے ٹال دیا۔ اور کہدیا کہ جب خود آؤنگا مل لوں گا۔ اس طرف نواب چھبن صاحب کی لڑکی کی شادی میں پندرہ روز سے ایسا پھنسا کہ توبہ بھلی۔ مرنے تک کی فرصت نہ ملی۔ نواب صاحب نے سارا بوجھ میرے ہی اوپر ڈال دیا اور خود انوری کے کوٹھے پر تنمبیں اڑا یا کئے۔ اب لڑکی کی بات کا معاملہ ذرا بھی کسی چیز میں خامی رہ جائے تو بس ناک ہی کٹ جائے۔

"اب تو فرصت ہے آپ کو؟" ارشد نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"ہاں۔ بس آج کی رات فرصت ہے۔ کل سب بقیہ حسابات چکانا ہیں۔"

ارشد نے مجھے آنکھ ماری اور ہم دونوں کی مشترکہ خوشامد سے مرزا صاحب اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ اس وقت ہم دونوں کی ہمراہی میں مہ جبیں کے یہاں چلیں اور اس سے ارشد کا تعارف نہایت زوردار سفارش سے کرا دیں۔ مرزا صاحب نے جلدی جلدی عشاء کی نماز سے فراغت پائی اور اپنے سونے کے بٹن والی شیروانی زیب تن کر کے ہم لوگوں کے ساتھ جھومتے چکلے کی طرف چل پڑے۔ چکلہ پہونچ کر مرزا صاحب نے ناظم جان کے بیٹھکے میں قیام کیا اور ستارو اُستاد کو بلا بھیجا۔ ستارو اُستاد آئے تو مرزا صاحب کا اشارہ سمجھ کر وہ فوراً مہ جبیں کے کوٹھے پر راستہ صاف کرانے کے لیے بھاگے قریب پون گھنٹے میں لوٹ کر آئے اور اس عرصہ میں مرزا صاحب نے اپنے کئی دوست اور آشنا کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا اور ان سے خوش گپیاں ہانک رہے تھے۔ میں اور ارشد سڑک پر گھوم رہے تھے۔ اور ہم لوگوں نے دیکھا کہ مہ جبین کے کوٹھے سے لڑکھڑاتے ہوئے ایک سیٹھ صاحب برآمد ہوئے اور اپنی موٹر میں بیٹھ کر نو دو گیارہ ہو گئے۔ راستہ صاف ہوا تو ستارو اُستاد کے ساتھ مرزا صاحب نے آگے قدم بڑھایا۔

ہم لوگوں نے مہ جبیں کے کوٹھے کی ابھی چوتھائی سیڑھیاں طے کی ہوں گی کہ اوپر سے آتے ہوئے ایک مولوی صاحب نظر پڑے۔ "اخاہ بھائی جمن ایک مدت کے بعد!" کہتے ہوئے مرزا صاحب لپکے اور بھائی جمن وارفتہ خطمی ہو کر دوڑ پڑے اور مرزا صاحب سے لپٹ گئے۔ دونوں میں بڑی شکایت اور حسرت

کا معانقہ ہوا۔ کھسر پھسر کرتے اور ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے دونوں اوپر چڑھنے لگے۔ ہم لوگ پیچھے پیچھے تھے اور ہمارے پیچھے ستار والے استاد۔ دفعتاً میاں چمن نے نہ معلوم کیا بات کہی کہ مرزا صاحب آخری زینہ پر ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا اور کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کے قلب کی حرکت بند ہو رہی ہو۔ چند لمحے وہ بالکل ہی سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے۔

بھائی چمن نے کہا۔ آئیے آئیے۔ مرزا صاحب تشریف لائیے!! مرزا صاحب چونک پڑے اور فوراً یہ کہتے ہوئے مڑ گئے۔ "نہیں نہیں اس وقت کچھ طبیعت ـــ" مرزا صاحب نہایت عجلت کے ساتھ زینے سے اترے اور نیچے سڑک پر بڑی تیزی سے گھر کی طرف رخ کر دیا۔ میں اور ارشد مرزا صاحب کی اس بدحواسی پر بے حد متعجب تھے۔ اتنے متعجب کہ ان سے یہ سارا ردِ عمل تھوڑی دیر تک پوچھا بھی نہ سکے۔ مرزا صاحب آگے آگے تھے اور ہم لوگ ان کے پیچھے، وہ کچھ اس تیزی سے قدم بڑھا رہے تھے کہ ہم لوگ بڑی مشکل سے ان کا ساتھ دے پاتے۔

ارشد نے مجھ سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ قلب پر کوئی دورہ پڑ گیا"

میں نے مرزا صاحب کو مخاطب کیا۔ "کیوں مرزا صاحب خیریت تو ہے کیسی طبیعت ہے۔ خدانخواستہ کوئی دورہ پڑ گیا" مرزا صاحب نے ایک نگاہِ غلط انداز سے ہم لوگوں کو دیکھا اور کچھ نہ بولے۔ گھر کی نکڑ کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے اور نہایت پریشانی کے عالم میں ہم لوگوں سے کہنے لگے۔

"بھئی تم لوگ جانا چاہو تو جاؤ۔ میں منع نہیں کرتا" میں نے عرض کیا۔

"آخر یہ معمہ کیا ہے مرزا صاحب کچھ طبیعت ناساز ہے؟"

مرزا صاحب نے قدرے بگڑ کر کہا۔ "آخر کوئی دودھ پیتے بچے تو ہو نہیں تم لوگ جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ میں جاؤں یا نہ جاؤں اس سے تمھیں واسطہ؟"

ارشد نے کہا۔ "مرزا صاحب۔ میرا دم گھٹا جا رہا ہے خدا کے واسطے بتا دیجیے کہ یہ کیا راز ہے؟"

مرزا صاحب کچھ نہ بولے اور اپنے مکان کے بیرونی کمرے میں پہونچ کر پلنگ پر لیٹ گئے۔ چند منٹ مرزا صاحب خاموش رہے پھر نہایت شان سے سر ہلا کر بولے۔ "تمھیں معلوم ہے کہ یہ مہ جبیں کون ہے؟" ہم لوگوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ پھر بولے "کلو جان کی لڑکی ہے۔ کلو جان کی جو مرشد آباد چلی گئی تھیں —— کلو جان شاہ مشکل کشا مولانا عبدالمعروف ذوالنون صاحب قبلہ و کعبہ کی طوائف۔ یہ مہ جبیں ان کی دختر ہے اور میری پیرزادی۔" مرزا صاحب نے گرج کر کہا ——

مرزا صاحب پاسِ ادب سے کبھی اپنی پیرزادی کے کوٹھے پر نہیں چڑھے مگر انھوں نے واقعتاً مہ جبیں کو مہ جبیں ہی بنا دیا۔

خُدا ترسی

خدا ترسی بھی کتنا مبارک و مسعود اور پاکیزہ جذبہ ہے! ہم میں اگر یہی جذبہ بقدرِ ضرورت موجود ہوتا تو آج نہ ریڈیو ہوتا نہ مشین گن۔ نہ پولیس چوکی نہ دیا آنرم اور نہ اسپتال نہ یتیم خانے۔ نہ پنڈت چھیلا شنکر اور نہ مولانا نورُ علی انور۔ اور نہ ایٹم بم اور نہ وزرائے خارجہ کی کانفرنسیں خیر یہ تو کچھ بے ربط سی باتیں ہیں، اصل مطلب کہنے کا یہ ہے کہ مولانا عبدالقدوس اپنے جبہ و قبہ اور داڑھی کی پوری ذمہ داری کے ساتھ فرماتے ہیں کہ انھوں نے فلسفہ اور تصوف کی پونے تین ہزار کتابیں پڑھ کر یہ قطعی نتیجہ نکالا ہے کہ جب انسان میں خدا ترسی کا جذبہ نہیں موجود ہوتا وہ انسان ہی نہیں ہوتا ہے۔ اور چوں کہ دنیا میں خدا ترس انسانوں کا قحط ہے یا بقول مولانا "قحط الرجال ہے" لہٰذا اسی وجہ سے آئے دن ان کی خانقاہ کی تو دقلیان گرتی رہتی ہیں لیکن صدر بازار میں نئے نئے ناچ گھر اور شراب خانے بنتے رہتے ہیں۔ پنڈت رام بھروسہ کو بھی اس مسئلہ سے کامل اتفاق ہے اور وہ تو اپنی تقریروں میں یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ اگر انسان کو خان بہادر یا رائے بہادر

یا لاٹ بہادر ہی کیوں نہ بنا دیا جائے اور اس کے انسان ہونے کے متعلق ڈاکٹری سرٹیفکیٹ اور راشن پرمٹ بھی حاصل کرلیا جائے لیکن کم از کم وہ تو اس انسان کو اس وقت تک جامۂ انسانیت سے باہر ہی سمجھیں گے جب تک کہ اس میں خدا ترسی کا جذبہ نہ موجود ہو اور وہ ان کے گئو آشرم کے لئے حسب حیثیت چندہ نہ دے۔ اس موقع پر اپنے ایک عزیز کا جو سب انسپکٹر پولیس ہیں اور اپنے جبر و تعدی اور رشوت ستانی کے معاملہ میں اپنے ہم پیشہ حضرات میں پیش امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مقولہ یاد آرہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر خدا نخواستہ کبھی خدا ترسی کا جذبہ میرے دل میں پیدا ہوتا ہے تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میری قوت مردانگی میں فرق آرہا ہے اور میں فوراً دہلی سے دوائیاں منگا کر ان کا استعمال شروع کر دیتا ہوں۔

خدا ترسی واقعی بڑا پاکیزہ جذبہ ہے!! اور اسی وجہ سے آئے دن منبر و محراب سے۔ جنّت کی لالچ اور جہنم کی دھمکی سے۔ عدالت کے بیانات اور حکومت کے اعلانات سے۔ لیڈروں کی تقریروں اور اخبار نویسوں کی تحریروں سے۔ مولوی صاحب کے فتوے اور پنڈت جی کے اپدیش سے۔ سینما کے اشتہارات اور بے روزگاروں کی درخواستوں سے۔ آزاد نظموں کے شاعروں اور الکشن کے ہنگاموں سے غرضیکہ ہر ممکن اور ناممکن طریقے سے اس مبارک اور مسعود جذبہ کی تبلیغ اور تلقین ہوتی رہتی ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات تحفظ ہندستان کے قانون کے بل بوتے پر یہ جذبہ زبردستی بھی طاری کر دیا جاتا ہے جیسے کہ ابھی ایک سال صوبہ کے ہر کاشتکار سے اس کے لگان کا ایک چوتھائی ریڈ کراس سوسائٹی کے لئے جبریہ وصول کرلیا گیا تھا۔ لیکن وائے بر حال ما کہ ہم کمبختوں پر ان تمام مساعیٔ جمیلہ کا

کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور اس جذبے سے اس قدر بھاگتے اور بچتے ہیں جیسے طاعون کی بیماری یا مرکٹے بیل سے۔

ہمارے محلہ میں جہاں رہنے والوں کی زیادہ تر تعداد طالب علموں، جینوں، کلرکوں، ایڈیٹروں اور لسکٹ فروشوں کی ہے۔ یہ جذبہ کسی شخص کو چھو تک بھی نہیں گیا ہے۔ اس جذبہ کے فقدان کا ادنیٰ ترین مظاہرہ ہر روز صبح کو بم پولیس کے دروازہ پر ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنی ضرورت کو دوسرے کی ضرورت یا پاس وحشیانہ طریقے سے ترجیح دیتا ہے اور طاقتور کمزوروں کو نظر انداز کر کے اس بری طرح سے ان کا پیدائشی حق غصب کر لیتے ہیں کہ اکثر اوقات عین شاہ راہ عام پر ناگفتہ بہ حادثات واقع ہو جاتے ہیں اور اس مقولہ کی صداقت پر ایمان لے آنا پڑتا ہے کہ "حق دار ترسیں اور انگار برسیں" اور صرف یہی نہیں بلکہ بیچارے نیازمند کا جو غیر قانونی طور سے بے نیازی حاصل کر لیتا ہے میونسپلٹی کی جانب سے چالان بھی ہو جاتا ہے۔ اور وہ غریب ہمہ تن نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ کی تفسیر بن کر رہ جاتا ہے۔

ابھی تین ہی چار مہینے ہوئے جب مولوی عبدالسلام صاحب نے محلہ میں ایک میلاد شریف کرنے کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کیا تھا۔ آٹھ دس روز کی منت وسماجت اور سر مغزنی کے بعد بیچارے کے پاس کل اٹھارہ روپیہ جمع ہوئے جسمیں بھی پانچ روپیہ کا طوائف کے تھے۔ چندہ جمع ہوتے وقت تو تمام اہالیان محلہ کی نانیاں مرگئی تھیں لیکن میلاد شریف کے تباشوں کا حصہ لینے کے لئے ہر کس وناکس شریک تھا اور نہایت بے غیرتی سے الٹی دھونس یہ دے رہا تھا کہ سینکڑوں روپیہ چندہ کا جمع ہوا ہے ہم نہ حصہ لیں گے تو پھر کون لے گا۔" گویا مولوی

صاحب بیچارے کے خلاف نہایت سخت منتقمانہ جذبات سے سرشار تھا ـــــ صرف اٹھارہ روپیہ کے بتاشے اور پانچ سو کا مجمع! ـــــ وہی ہوا جو کہ نہ ہونا چاہیئے تھا یعنی بتاشوں کے ساتھ بیچارے مولوی صاحب کی پگڑی، شیروانی اور کچھ اور متبرک چیزیں بھی تقسیم ہو گئیں۔

لیکن بحمد اللہ یہ سب واقعات اب پرانی تاریخ ہو چکے ـــــ اگر تاریخ اپنے آپ کو دہرا نہ دے ـــــ اور ہمارے محلّے کے لوگوں کو یکایک خدا ترسی کا ہیضہ ہو گیا اور اس متعدی مرض کے جراثیم سارے شہر میں پھیلتے ہوئے نظر آنے لگے اور یہ جراثیم شروع شروع میں یوں نمودار ہوئے کہ برما سے بھاگی ہوئی دو عورتیں اور تین بچے حسنِ اتفاق سے ہمارے محلّے میں آنکلے ـــــ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے یہ عورتیں ادھیڑ عمر کی تھیں اور بڈھے لوگ انھیں جوان اور جاذب توجہ سمجھ سکتے اور لڑکے کام کاج کرنے کے قابل تھے۔

خاں صاحب محمد یار کی خوش قسمتی کہ پہلے پہل یہ بھاگی ہوئی مخلوق انھیں کے ہاتھ لگی۔ انھوں نے فوراً اس کی سرپرستی قبول کر لی اور اپنے مکان کا ایک چھوٹا سا حصّہ ان کی رہائش کے لئے وقف کر دیا۔ کئی روز تک تو سارے محلّہ میں خاں صاحب کی خدا ترسی کی دھوم مچی رہی اور ہر شخص ان کو دیکھ دیکھ کر یہ شعر پڑھنے لگا۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا!

لیکن اس کے بعد اہالیانِ محلہ خاں صاحب کو دیکھ کر اشاروں اور

کنایوں میں گفتگو کرنے لگے اور ان کے چال چلن کے بارے میں نہایت بد ترین قسم کے شبہات ظاہر کرنے لگے۔ اب کچھ اس قسم کی افواہیں اُڑنے لگیں۔

"اس بڑھاپے میں یہ شوقینی تو دیکھو!" "اب ماشاءاللہ روزہ دواخانہ شباب آور سے گولیاں خریدی جاتی ہیں!"

"واقعی کسی نے سچ کہا ہے خدا دیتا ہے تو چھپّر پھاڑ کر!" "اس بڈھے کھوسٹ کی قسمت تو دیکھو۔ ایک چھوڑ دو دو اور دونوں جوانی سے بھرپور!" "یہ خدا ترسی ہی کہ مظلومین کی جبر یہ عصمت دری!"

"یہی خاں صاحب تھے جو بڑے مولوی بنے گھومتے! اب کیا کہتے ہیں چچا؟"

"یار یہ تو ہمارا حصّہ تھا!! اس کوڑہ سا...... کیسے لے بھاگا۔

ع دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"

"خاں صاحب تو از سرِ نوجوان ہو رہے ہیں!" وغیرہ وغیرہ۔

پنڈت مست رام نے تو ایک دن سر بازار خاں صاحب سے کہدیا۔ "کیوں دوست کچھ یاروں کا بھی حصّہ ہی۔ کہیں بدہضمی نہ ہو جائے تمھیں"

خاں صاحب جلے بھُنے تو بیٹھے ہی تھے فوراً چراغ پا ہو گئے۔ "تمھارے پیٹ میں کیوں درد ہو رہا ہے کچھ ماں بہنیں ہیں تمھاری!"

محلہ کے آٹھ دس جوان اور دل پھینک اوباشوں نے خاں صاحب کے گھر کا چکر کاٹنا اور بہ آواز بلند اشعار پڑھنا شروع کر دیا اور بیچارے خاں صاحب کا سونا جاگنا اور کھانا پینا حرام ہو گیا ہر وقت لٹھ لئے ان ہی اوباشوں کی گھات میں لگے رہتے اور گالیاں بکا کرتے۔ قصّہ مختصر ایک مہینہ کے اندر ہی اندر

سارے محلہ کو خاں صاحب سے نفرت اور دشمنی پیدا ہوگئی اور شرافت حسین کی صدارت میں ایک خفیہ جلسہ نے متفقہ طور سے یہ رزولیوشن پاس کر دیا کہ "بر ما سے بھاگ کر آئی ہوئی عورتوں اور بچوں کی نگہداشت اور فکر معاش کرنا اہالیان محلّہ کی خدا ترسی کا اوّلین فریضہ ہے۔ لیکن خاں صاحب محمد یار نے جس غاصبانہ طریقہ سے اس "فریضہ" کو تنہا خود ہضم کر لیا ہے وہ نہایت افسوس ناک ہے اور اس سے نہ صرف خاں صاحب کی بدنیتی ثابت ہے بلکہ ان کے چال چلن اور ان کے باپ دادا کے نام پر بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔ اس عمر میں یہ عیاشی کسی صورت خاں صاحب کو زیب نہیں دیتی اور وہ قطعاً اس قابل ہیں کہ ان کو سنگسار کر دیا جائے۔"

خاں صاحب کو جب اس جلسہ کی کارروائی کا علم ہوا تو مارے غصّے کے دیوانے ہو گئے اور حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگے "ہاں کرتے ہیں عیاشی کسی کے باپ دادا کا اجارہ" اس اعلان نے رہی سہی کمی کو بھی پورا کر دیا اور اگر کسی قسم کا کوئی شبہ باقی بھی رہ گیا تھا تو وہ کامل یقین میں تبدیل ہو گیا اور بیچارے خاں صاحب اقبالی مجرم بن گئے۔ ازراہ خدا ترسی ایک مقامی اڈیٹر نے اپنے نامی وگرامی اخبار میں اس واقعہ کو قرب قیامت کی علامت سمجھ کر اس پر ایک مقالہ بھی لکھ ڈالا۔ اس مقالہ نے سب کو قائل کر دیا کہ تقریر سے زیادہ تحریر میں اثر اور زور ہوتا ہے چنانچہ خاں صاحب کے خلاف گم نام اشتہارات شائع ہونے شروع ہو گئے۔ ایک اشتہار کی سرخی یہ تھی۔

"مظلومین کی جبریہ آبرو ریزی کا عبرتناک مظاہرہ۔"

چند ہی روز بعد اس معاملہ نے ایک بالکل ہی نیا رنگ پکڑ لیا شردھانند پارک میں ہندوؤں کا ایک بہت بڑا جلسہ "ہندو دھرم زندہ باد" اور "پنڈت رام

زندہ باد" کے درمیان منعقد ہوا اور اس میں تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر نہایت غیظ و غضب اور جوش و خروش کے ساتھ یہ رزولیوشن پاس کیا کہ خاں صاحب محمد یار دو ہندو عورتوں اور تین ہندو لڑکوں کو جبریہ مسلمان بنا رہے ہیں۔ ان کے اس فعل بیجا سے تمام ہندو دھرم میں تہلکہ مچ گیا ہے اور وہ خطرہ میں آگیا ہے۔ تمام ہندو بھائیوں کی خدا ترسی کا پہلا فرض یہی ہے کہ وہ اپنی ان مظلوم اور لاچار ماں بہنوں اور بیٹے بھائیوں کو فوراً اس پنجۂ ظالم کے پنجۂ غضب سے نجات دلائیں۔ اور حکومت کو بھی متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ جلد از جلد ان قیدیوں کو آزاد کرا کے مقامی ہندو مہا سبھا کے سپرد کر دے ورنہ تمام ملک میں ایک دوسری مہا بھارت شروع ہو جائے گی۔

ظاہر کہ جب ہندو دھرم کی لاج پر حرف آنے لگتا ہے تو اسلام بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے چناں چہ جب ہندوؤں کے جلسہ کی خبر مسلمانوں کو پہونچی تو فوراً اسلام خطرہ میں آگیا اور خاں صاحب محمد یار کا خطرہ دور ہو گیا۔ دوسرے دن مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں منعقد ہو گیا اور "اسلام زندہ باد" "خاں صاحب محمد یار زندہ باد" کے نعروں کے درمیان یہ رزولیوشن پاس کر دیا گیا کہ "برما سے بھاگ کر آئی ہوئی عورتیں اور لڑکے مسلمان ہیں۔ ہندو ان کو جبریہ چھین کر شدھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس فعل بے جا کے تدارک کیلئے ہر خود دار اور خدا ترس مسلمان کو از سر نو محمود غزنوی۔ محمد غوری اور نادر شاہ کی روایات کو تازہ کر دینا چاہیئے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ جلسہ حکومت کو بھی متنبہ کر دینا چاہتا ہے کہ وہ کسی بھول میں نہ رہے بلکہ خوب کان کھول کر سن لے کہ اگر اس معاملہ میں اس

نے کسی قسم سے مداخلت فی الدین کی تو بس ع

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب روز جلسے ہونے اور جلوس نکلنے لگے۔ والنٹیروں کی بھی بھرتی شروع ہو گئی اور چندہ جمع کرنے کی کاپیاں چھپ کے تیار بھی نہ ہونے پاتیں کہ ختم ہو جاتیں، اشتہارات کی بھرمار سے سارے محلہ کی دیواریں چھپ گئیں۔ غرضکہ ایک بے پناہ طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر کے لیڈروں کے نام مع کرایہ وبھتے کے دعوت نامے جانے لگے اور مقامی لیڈروں نے اپنے نت نئے کرتب دکھانا شروع کر دیئے۔ ڈپٹی کمشنر کے پاس ڈیپوٹیشن بھیجے گئے اور وائسرائے کے نام کھلی چھٹیاں شائع کی گئیں وغیرہ وغیرہ۔ قصہ مختصر یہ کہ ایک حد درجہ خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی۔

اسی ہلڑ اور ہنگامے میں ایک ہفتہ گزر گیا اور رفتہ رفتہ لوگوں کے خدا ترسی کے جذبے ٹھنڈے پڑنے لگے اور وہ کچھ بے تعلق ہو چلے لیکن پھر ایک دم سے حکومت کی جانب سے اعلان کر دیا گیا کہ اس امر کی تحقیقات کے لئے کہ آیا برما کی عورتیں اور لڑکے ہندو ہیں یا مسلمان ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جاتا ہے ——

—— اور اس کمیشن کی رپورٹ موصول ہو جانے کے بعد گورنمنٹ اپنی آئندہ پالیسی کے متعلق غور و خوض کرے گی اور آئندہ کے لئے کوئی مستقل اقدام کرے گی۔ حکومت کے اس اعلان نے بجھتے ہوئے شعلوں پر تیل چھڑک دیا۔ کہاں تک ہنگامہ آرائیاں بیان کی جائیں مختصر یہ کہ پہلے کمیشن کے افراد کے انتخاب کے متعلق پر جوش احتجاجی جلسے کئے گئے۔ پھر طے یہ پایا کہ اس کا بائی کاٹ کر دیا جائے اور بالآخر جب بن بلائے مہمان کی طرف یہ کمیشن محلہ میں آ ہی پہونچا تو دونوں فریقین اس کے سامنے اپنے

بیانات قلمبند کرانے اور حکومت کو اپنی وفاداری کا اطمینان دلانے کے لئے تیار ہو گئے
پیش بندی کی صورت میں کچھ لوگ نعرے لگاتے ہوئے جیل خانے بھی پہونچ گئے۔
کئی دعوتوں کی بدہضمیوں کے بعد کمیشن نے جو اپنی طول طویل رپورٹ مرتب کی اس
کا ماحصل صرف یہ تھا کہ عورتیں اور لڑکے مسلمان نہیں ہیں لیکن ان کو مسلمان بنا لئے جانے
کی کوئی کوشش بھی نہیں کی جا رہی ہے"

اس رپورٹ کے شائع ہونے پر کہرام مچ گیا۔ بہ یک وقت ہندوؤں کا جلسہ
شردھانند پارک میں اور مسلمانوں کا جلسہ جامع مسجد میں منعقد ہوا۔ دونوں جلسے بدترین
قسم کے احتجاجی تھے لہذا مجمع کا جوش و خروش احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا مست رام
نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "اگر وہ مسلمان نہیں ہیں اور ہندستان میں رہتی ہیں تو وہ
قطعاً ہندو ہیں" وغیرہ وغیرہ انھیں کمیشن سے سب سے زیادہ شکایت یہ تھی کہ اس نے
خاں صاحب کے چال چلن کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں قائم کی اور اس معاملہ
میں صریحاً ان کی پاسداری کی انقلاب —— بغاوت —— ستیہ گرہ ——
ہندو دھرم .... رام راجیہ .... اور اسی قسم کے بہت سے اور
الفاظ بھی سنائی پڑے۔ خاں صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "افسوس! ایک
گدھا بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ جب کوئی شخص ہندو نہیں ہوتا ہے تو وہ لازماً
مسلمان ہوتا ہے۔ چوں کہ کمیشن میں مسلمانوں کی نمائندگی حسب دل خواہ نہیں تھی۔ اسی
وجہ سے اس قدر ناپاک اور کفر خیز رپورٹ تیار کی گئی ہے۔ اسلام خطرہ میں ہے
—— جہاد —— سازش تیغ در دست و کفن بر دوش .... ؏

ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

وغیرہ وغیرہ۔
کمیشن کی رپورٹ سے دونوں فریق بہت سخت نالاں تھے اور احتجاجی تحریک قانون شکنی بھی کرنے والے تھے کہ یکایک حکومت کی طرف سے ایک دوسرا کمیشن اس امر پر متعین کر دیا گیا کہ وہ گزشتہ کمیشن کی غیر جانبداری کے متعلق تحقیقات کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے لیکن قبل اسکے کہ اس کمیشن کا پہلا جلسہ بھی منعقد ہو پاتا اس خبر سے سارے شہر میں سنسنی پھیل گئی کہ برما کی دونوں عورتیں اپنے ساتھ کے تینوں لڑکوں کو جو کہ ان کے ننھے تھے چھوڑ کر رات کی تاریکی میں کہیں فرار ہو گئیں ہیں۔ فریقین نے جب اس خبر کو سنا تو صبر کا دامن ایک جھٹکے کے ساتھ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور وہ ہاتھا پائی اور لپاڈگی کرنے پر بے اختیارانہ مجبور ہو گئے' وہ تو کہیئے کہ عین موقع پر پولیس آگئی ورنہ نہیں معلوم کہ اس روز کیا ہو جاتا۔
مسلمان کہتے "ہندوؤں نے اغوا کر لیا ہے"
ہندو کہتے "مسلمانوں نے پنجابیوں کے ہاتھ فروخت کر لیا ہے"
دونوں طرف کے کچھ سمجھدار لوگ یہ بھی کہتے کہ "جاپانیوں نے ہوائی جہاز کے ذریعہ واپس بلا لیا ہے چھپی ہوئی جاسوس تھیں دونوں عورتیں!" وارڈن جی جو آپس کے جھگڑوں اور فسادوں کو رویوں میں تحلیل کر کے سلب کر لینے میں اپنی مثال آپ تھی۔ نہایت بیدار مغز اور خدا ترس ثابت ہوئے۔ انھوں نے آتے ہی خان صاحب اور پنڈت ست رام کو گرفتار کر لیا۔ اور اپنے حساب فتنہ و فساد کو رفع دفع کر دیا لیکن یہ دونوں لیڈر بھی بڑے گھاگ واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ حوالات پہنچنے سے بیشتر ہی معافی مانگ کر رہا ہو گئے اور عین اسی وقت جب کہ ان دونوں لیڈروں

کی گرفتاری کی بنا پر احتجاجی جلسہ ہو رہا تھا موقع واردات پر پہونچ گئے اور اپنا مشترکہ فیصلہ با آواز بلند یک زبان ہو کر سنا دیا۔

"ایک لڑکا خاں صاحب کو دے دیا جائے۔ ایک لڑکا پنڈت مت رام کے سپرد کر دیا جائے اور ایک لڑکا کام کرنے کی غرض سے داروغہ صاحب کی خدمت میں نذر کر دیا جائے"۔

مجمع "ہندو مسلم اتحاد زندہ باد" "خاں صاحب زندہ باد" اور "پنڈت جی زندہ باد" کے نعروں پر بحسن خوش اسلوبی ختم ہو گیا۔

خدا ترسی کا مواد ایک جگہ جمع ہو جانے سے جو ہنگامہ اور انتشار پیدا ہو گیا تھا وہ اس کے تین جگہ تقسیم ہو جانے سے محلہ کے امن و امان میں تبدیل ہو گیا ہے۔ دفتہ رفتہ تینوں بر می لڑکے بھی بھاگ چکے ہیں اور ہمارے محلہ میں خدا ترسی کے متعلق کسی آسمانی علامت کے ظہور پذیر ہونے کا بڑی بے چینی سے انتظار ہے!۔

کلجگ

قصبہ بھٹ پور میں جس روز لالہ دو نے چند بیوپاری کو اطلاع ملی کہ بنگال میں ایک سو بیس روپیہ من معمولی چاول بک رہا ہے۔ ان کو بڑا سخت صدمہ ہوا۔ اپنی دوکان پر چھبو مل بساطی سے کہنے لگے "یار دیکھو بنگال میں کیا اندھیر ہو رہا ہے۔ آدمی کو آدمی کھائے جا رہا ہے۔ ننھے ننھے غریب بچوں کا بلکنا خیال کرو اور ایک سو بیس روپیہ من چاول کے نرخ پر غور کرو۔ کلجگ ہے کلجگ۔ جے بھگوان!" رات کو لالہ جی سونے لیٹے تو للائن سے بولے "ارے کچھ سنا تم نے بنگال میں ایک سو بیس روپے من چاول بک رہا ہے اور یہاں ہم تیس روپے میں بھی بیچتے ہیں تو لوگ شکایت کرتے ہیں کہ گراں بہت ہیں۔ کلجگ ہے کلجگ۔ جے بھگوان!"

دوسرے روز یونیورسٹی کے کچھ طالب علم بنگال کے قحط زدوں کے لئے چندہ مانگنے آئے تو لالہ جی نے فوراً اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک دس روپیہ کا نوٹ ان کے حوالے کر دیا اور اپنے ہمسایہ دوکاندار شیخ جمعراتی سے پکار کر کہا "بھئی

شیخ صاحب بنگال کی ضرور کچھ مدد کرنا چاہیئے۔ سارا دیس بھوکوں مرا جا رہا ہے ۔ کلجگ ہے کلجگ۔ جے بھگوان ٭

اسی روز شام کو لالہ جی نے اپنے منعم کو ہدایت کی کہ چاول کی جو بوریاں دوکان پر لگی ہوئی ہیں انھیں آج رات ہی میں دیہات کی خفیہ گوداموں میں پہونچا دیجیے۔ دوکان پر ایک چھٹانک بھی چاول فروخت نہ کیا جائے بلکہ کل سویرے قصبہ کی دوسری دوکانوں پر بھی جس قدر چاول مل سکے خرید لیا جائے۔

"اپنے صوبہ میں بھی غلہ کی کمی پڑگئی ہے" لالہ جی نے سنا اور منھ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد بولے "کیا کیا جائے کلجگ ہے کلجگ! جے بھگوان!" آئے دن لالہ جی کو خبریں ملتی رہتی تھیں کہ صوبہ میں کیا خود ان کے ضلع میں قحط کا طوفان امنڈتا چلا آرہا ہے اور وہ اپنا پیٹ سہلا سہلا کر چیختے۔ "کلجگ ہے کلجگ۔ جے بھگوان!"

ضلع کی صورت حال روز بروز نازک ہوتی جاتی۔ قصبہ بھٹ پور میں بھی غلہ نایاب ہوگیا۔ گرد و نواح کے ہزاروں فاقہ زدگان اور بھکاری قصبہ میں بھر آئے۔ بڈھے مرد اور عورتیں۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں۔ مختلف عمر کے چھوٹے چھوٹے بچے قصبہ کی سڑکوں اور گلیوں میں "روٹی" "بھوک" "اللہ بھلا کرے" "بھگوان کے نام پر" چیختے گھومنے لگے۔ قصبہ کے لوگ انتہائی پریشانی اور وحشت سے ادھر ادھر سر دوڑانے لگے۔ "غلہ"؟ "اناج؟" ہر کوئی ایک دوسرے سے یہی پوچھتا۔ غریب لوگ گھروں سے باہر نکل آئے اور موسط طبقے کے لوگوں کے گھروں سے دھواں اٹھنا بند ہوگیا۔

جوان لڑکے اور مرد جنگلوں اور ویرانوں میں گھومنے لگے اور جوان لڑکیاں اور عورتیں گلی کی نکڑوں۔ دیوار کی آڑوں اور دوسروں کے مکانوں میں نظر آنے لگیں۔

لالہ وونے چند اپنی کنجیوں کا گچھا پیشتر سے کہیں زیادہ مضبوطی سے اپنی دھوتی میں باندھنے لگے اور اس کو بنیان کے اوپر سے ٹٹول ٹٹول کر دن بھر یہی چیخنے لگے۔ "کلجگ ہے کلجگ۔ جے بھگوان!" شہر کے بہت سے آدمی ان کے پاس آئے۔ روئے۔ خوشامدیں کیں۔ ہاتھ جوڑے اور کہا کہ "اگر آپ کے پاس غلہ ہو تو ہماری نہیں ہمارے بچوں ہی کی جان بچا لیجئے۔" لیکن ان باتوں سے لالہ جی پر کلجگ ہے کلجگ! جے بھگوان!" کا اور شدید دورہ پڑ جاتا۔ وہ کہتے "میرے پاس غلہ ہوتا تو کیا میں اپنے ساتھ نرک لے جاتا۔ غلہ ہی نہیں ہے تو میں کیا کروں۔ تھوڑا بہت جو تھا اس کو دے کر کل للائن نے شمبھو کھیڑہ کی چار لڑکیاں لے لی ہیں۔ اب میں خود کھاؤں یا ان کو کھلاؤں۔ مجھ سے زیادہ تو وہی کھا جائیں گی۔"

لالہ جی کی دھوتی کی کنجیاں رات کو گیارہ بجے کے بعد جب قحط زدہ انسان تھک ہار کے کونوں میں دبک رہتے گردش میں آتیں اور قصبہ کے انسپکٹر پولیس کی معرفت نامعلوم مقامات سے غلہ کی چھوٹی چھوٹی گٹھریاں روپے کی تھیلیوں کے عوض میں لالوں کے ہاتھ فروخت کی جاتیں —— لیکن غلہ کی قیمت ہمیشہ صرف روپوں میں نہیں وصول کی جاتی لالہ جی کے مکان کے اور پولیس کی چوکی کے احاطہ میں جو ایک دوسرے سے قریب تھے پھٹی چادریں اوڑھے سیدھی کمروالی پرچھائیاں بھی منڈلاتی پھرتیں

اور وہ دو دو چار چار مٹھی اناج کی خاطر نہیں معلوم کیا کیا سودا کر ڈالتیں۔

صبح ہونے سے پہلے جب یہ پرچھائیاں اپنا منھ چھپائے ہوئے باہر نکلتیں تو احاطہ سے تھوڑی ہی دور پر ان کے چھوٹے چھوٹے متعلقین جو بڑی دیر سے ان کی راہ دیکھ رہے ہوتے ان کے چمٹ جاتے اور وہ اپنی چادر کا کھونٹ کھول کر اپنی رات بھر کی کمائی کو ایک لحہ میں تقسیم کر دیتیں۔ لیکن بعض کھونٹ خالی بھی ہوتے۔ اس مایوسی پر چھوٹے بچے اور بڈھی عورتیں تو چیخنے چلانے ہی لگتے لیکن بعض اوقات وہ باپ اور شوہر جنھوں نے اپنی بیٹیاں اور بیویاں بھیجی ہوتیں غصے سے تلملا اٹھتے۔

لالہ دو نے چندان لوگوں کو دانت پیتے اور گالیاں بکتے دیکھتے تو گھبرا کر بڑی زور سے چیختے "کلجگ ہی کلجگ۔ جے بھگوان!"

مندر میں سنکھ بجایا گیا۔ مسجدیں دعائیں مانگی گئیں۔ حکومت کو تار بھیجے گئے۔ اخبارات میں مضمون لکھوائے گئے لیکن قحط تھا کہ بھرے ہوئے سمندر کی طرح پھیلتا اور گہرا ہی ہوتا چلا جاتا۔ بھٹ پور کے قرب وجوار کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ روز خبریں آتیں کہ وہاں کے ماں باپ اپنے بچوں کا گوشت کھا رہے ہیں۔ بھٹ پور میں مائیں یہ قصے سنتیں تو خوف سے تھر تھر کانپنے لگتیں اور اپنے بچوں کو ہاتھ لگاتے بھی ان کو ڈر معلوم ہوتا۔

مئی کا مہینہ تھا۔ لو کے تھپیڑے زمین کی چولیں ہلائے رکھتے دیتے۔ آفتاب ایک منھ پھاڑے ہوئے تنور کی طرح معلوم ہوتا جو ہر لحظہ انتہائی غضبناکی سے زمین

کی طرف بڑھتا ہی چلا آتا۔ زمین جلتے ہوئے توے کی مانند تپ رہی تھی اور اس کے سلگتے ہوئے بھورے رنگ پر گمان ہوتا کہ یہ بہت جلد سرخ ہو کر شعلہ بن جائے گی۔ جلتی ہوئی دھول کے بگولے اٹھتے تو معلوم ہوتا کہ چنگاریاں اڑ رہی ہیں۔ لیکن اس تپش، حدت اور گرمی سے کہیں زیادہ شدید بھوک کی تپش، حدت اور گرمی تھی۔ بھوک! بھوک! روٹی! روٹی! زمین سے آسمان تک یہی صدائیں بلند تھیں لیکن روٹی ناپید تھی۔ زمین سخت تھی اور آسمان دور!

قصبہ میں اب فاقہ زدگان کی موتیں شروع ہو گئی تھیں۔ موت کا حملہ سب سے پہلے بڈھوں اور بچوں پر شروع ہوا تھا۔ اور اب جوانوں تک پھیل گیا تھا لیکن جو مر گئے تھے ان کی حالت ان سے کہیں زیادہ اطمینان بخش معلوم ہوتی جو مر رہے تھے۔ باپ بیٹے۔ ماں بہن کے رشتے ٹوٹ چکے تھے اب کوئی کسی کا نہ عزیز تھا نہ رشتہ دار۔ نفسی نفسی کا عالم تھا اور سب ایک بڑی برادری، بھوکوں کی برادری کے افراد تھے اور ان کے درمیان خون کے رشتے سے زیادہ مضبوط رشتہ بھوک کا تھا۔

نعشیں سڑ رہی تھیں مرنے والے دم توڑ رہے تھے۔ نیم مردہ چیخ رہے تھے۔ قصبہ سنسان ہو چکا تھا۔ لالہ دونے چند کے مکان اور تھانہ پر چند بھوکوں نے حملہ بھی کیا تھا اور چند گولیاں کھا کر اپنی مشکلات کو دور کر لیا تھا۔ جو تھوڑے بہت لوگ قصبہ میں باقی بچے تھے وہ انتہائی وحشت اور پریشانی سے لاش کھاتے ہوئے

گدھوں اور کوؤں کے ساتھ چیخ رہے تھے " بھوک! بھوک! روٹی! روٹی!"
ساری فضا پر ایک عجیب ہو کا عالم چھایا ہوا تھا اور چھوٹی چھوٹی آوازوں سے مل کر زمین سے آسمان تک صرف ایک بڑی چیخ سنائی دیتی " روٹی!"

لالہ دو نے چند اب کچھ تھکے تھکے اور پریشان نظر آتے۔ وہ عجیب وحشت محسوس کرتے اور لمحہ بھر کے لئے بھی ایک جگہ نہیں بیٹھ پاتے۔ رات کے سناٹے میں وہ گدھوں کی قیں قیں اور گیدڑوں کی ہو ہو سنتے تو گھبرا کر صحن سے کمرے میں چھپ رہتے۔
صبح کا وقت تھا لالہ جی کسی کام سے اپنے مکان کی بالائی منزل پر گئے ہوئے تھے جہاں سے سارا قصبہ دکھائی دیتا۔ لالہ جی ایک لمحہ کے لئے صحن میں رک گئے۔ انھوں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا قبرستان کی طرح انسانوں سے خالی قصبہ کی گلیوں اور سڑکوں میں انسانی لاشوں پر گدھ، گیدڑ، کوے اور کتے لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو بھنبھوڑے کھاتے " کیا میں یہ سب روک سکتا تھا؟" بجلی کی طرح یہ خیال لالہ دو نے چند کے دماغ میں کوندا اور وہ اپنی کنجیوں کو ٹٹولتے ہوئے چیخ کر بھاگے " کلجگ ہے کلجگ۔ جے بھگوان!"
گدھوں کا ایک قافلہ قیں قیں کرتا ہوا ان کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔

کیوں لکھا؟

ایک خبر سنیئے جو شاید آپ نے اخبارات میں نہ پڑھی ہو۔ سندیلہ کے ایک گمنام ادیب کو ایک وکیل نے قتل کر دیا ـــــ غریب کو کون پوچھتا نہ داروغہ صاحب نے تحقیقات کی نہ تعزیتی جلسے ہوئے نہ ماتم پرسہ کے خطوط آئے اور نہ اس کے نام سے کوئی اسکول یا سوسائٹی کھول گئی۔ اس بیچارے کی موت خس کم جہاں پاک کے مصداق ہو کر رہ گئی۔ لیکن ہمارے دوست نسیم کو شاید اپنی مسیحا نفسی پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا۔ کچہری جا کر وکیل کو ڈھونڈھ نکالا اور پھر اسے بہلا پھسلا کر قبرستان لے گئے اور ''قانون فرائض دوستاں'' کی نہ معلوم کن کن دفعات کا واسطہ دے کر اسے مجبور کر دیا کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ ادیب کی قبر میں لیٹ رہے اور ادیب کو کم از کم اتنی فرصت دیدے کہ وہ ان کے رسالہ اضطراب کے خاص نمبر کے لئے ایک افسانہ قلمبند کر دے۔

چھ مہینے قبر میں رہنے والا ادیب کون سا افسانہ لکھے؟ ـــــــ برزخ کا! اجی توبہ کیجئے دم بھر میں گرد و پیش کی تمام داڑھیاں ہلنے لگیں اور ''نکالو اس ملعون کو'' ''شہر بدر کرو اس جہنمی کو'' ـــــــ

"قتل کر دو اس ملحد کو" وغیرہ وغیرہ کی صدائے بے ہنگام بلند ہو جائیں! پھر آخر کیا کیا جائے؟ افسانہ لکھنا برحق اور افسانہ کا موضوع لاپتہ!

ادیب نے "ایمان بالغیب" پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہوئے بغیر کسی موضوع اور بغیر کسی پلاٹ کے افسانہ لکھنا شروع کر دیا نہایت نیک نیتی سے ــــ اتنی نیک نیتی سے کہ اس نے آدھا لکھ بھی ڈالا لیکن پھر ــــ دکیل قبر میں لیٹے لیٹے اکتا گیا یا یوں کہہ لیجئے کہ اسکے موکلوں نے اس کی قبر کھدوا ڈالی اور وہ بھرا ادیب پر بپھرے ہوئے شیر کی طرح جھپٹا ــــ بڑی ہی تو تو میں میں اور چھینا جھپٹ کے بعد ادیب کی جان بچی اور اس غریب کو اتنی فرصت اور مل گئی کہ وہ اپنا نامکمل افسانہ مکمل کر دے لیکن ــــ اب اس نامکمل افسانہ کا مسودہ غائب تھا۔

وقت کم۔ کام نہ صرف زیادہ بلکہ مشکل، نسیم کی دھنک سر پر، دکیل کا چاقو سینہ پر۔ بات سر سے سرو تر۔ لالٹین چندھی۔ روشنائی پھیکی۔ قلم لنگڑا، بیگم کا حکم کہ "بس بند کرو اس بھان متی کے پٹارے کو" اور انکی سازش سے لڑکے کا چیخنا اور اس بری طرح سے چیخنا کہ سوائے اسکے کوئی چارہ نہیں کہ کانوں میں انگلیاں دیکر اور آنکھیں بھینچ کر لحاف میں گھس جایا جائے لیکن ــــ واہ رے بہادر ادیب تو اب بھی لکھ رہا ہے ــــ لکھے جا شاباش کچھ فکر نہیں کہ تو کیا لکھ رہا ہے ــــ تیری یہ جرأت ہی کیا کم ہے کہ ایسی دردناک فضا میں بھی تیرے ہاتھ میں قلم ہے۔

کبھی کبھی جی میں آتا ہے کہ لاؤ زندگی بھر میں جو کچھ لکھنا ہے، ایک دم ہی سے لکھ ڈالوں۔ ــــ خیال تو اچھا ہے یہ روز روز کی دانتا کِل کِل جائے ــــ لیکن معاً یہ خوف غالب آتا ہے کہ اگر میں زندگی بھر کا کھانا ایک ہی دن میں کھانے کی کوشش کروں تو ــــ ہٹایئے اس جھگڑے کو اور سنجیدگی سے کوئی مضمون لکھیئے ــــ لیکن کیا؟

ہمارے سودیشی ملک میں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں اور انشاء اللہ ہوتے رہیں گے اور کم ازکم ہماری قسم کے لوگوں کو ان سے کسی قسم کا دغدغہ بھی نہیں ہم بیک وقت فاقہ مست بھی ہیں۔ قوم کے لیڈر بھی ہیں اور ہنگامی موت سے ڈرتے بھی نہیں ہیں۔ ہمارے ایک "چیرلیشین" دوست ہم سے ایک روز ریسٹوراں کی میز پر نہایت ہمدردانہ اور معصومانہ انداز میں پوچھ بیٹھے "یہ فرقہ وارانہ فساد کیا ہوتے ہیں یہ کیا وباہی جو آئے دن ہندستان پر وارد ہوتی رہتی ہے اور جسکے زیر اثر ایک ساتھ کے رہنے بسنے والے ہندو مسلمان پاگل کتوں کی طرح ایک دوسرے کو کاٹنے اور بھنبھوڑنے دوڑ پڑتے ہیں"۔ میں نے عرض کیا کہ یہ جو کچھ آپ فرمارہے ہیں صرف اخبارات کا جھوٹا اور گمراہ کن پروپیگنڈہ ہی ورنہ دراصل یہ فرقہ وارانہ فساد ہمارے ملک کا ایک قومی کھیل یا جشن ہے جو مختلف تہواروں پر اور خصوصاً بقرعید، محرم، ہولی اور جنم اشٹمی کے موقعوں پر کھیلا جاتا ہے، یہ ایک قسم کی کبڈی ہوتا ہے جس میں مقامی لوگ اپنے آپ کو دو فرقوں میں بحساب حادثہ پیدائش تقسیم کر لیتے ہیں اور پھر لاٹھیوں۔ ڈنڈوں۔ بلموں اور کانتوں سے اس کو کھیلتے ہیں اور اپنا گھر بار، بیوی بچے سب اسکی بازی پر لگا دیتے ہیں۔ ہمارے دوست بہت زیادہ دہشت زدہ ہوگئے۔ اور انتہائی بزدلی کے لہجہ میں کہنے لگے "افوہ! تو یہ کھیل نہایت خوفناک ہوتا ہے اور اس میں جان و مال کا بڑا نقصان ہوتا ہوگا"۔ ہم نے بات ٹال دی اور کہا "یہ کچھ نہیں ہندستان ایسے ملک میں جہاں کروروں کی گنتی شمار نہیں دس یا پانچ ہزار موتوں سے آبادی پر کچھ اثر نہیں پڑتا اور مال تو زیادہ تر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہونچ جاتا ہے۔ مجموعی طور سے قومی دولت کم نہیں ہوتی"۔

ابھی یہی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ریسٹوران کا بیرہ دوڑتا ہوا آیا اور ہانپ ہانپ کر چیخنے لگا "بلوہ!...... چل گئی...... ہندو مسلم فساد!..... وغیرہ وغیرہ"۔

ریسٹوران فوراً بند ہو گیا اور ہم لوگ سڑک پر نکال دیے گئے۔ میں چھپتا چھپاتا دوڑتا بھاگتا کانوں میں انگلیاں دئے "اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے" اور جے بجے بجرنگ بلی کی جے کے کلیجہ ہلا دینے والے جیکارے سنتا اپنے گھر پہونچ گیا لیکن آٹھ دس روز کے بعد اپنے چمریشین دوست کی زبانی سنا کہ ان کی کافی مرمت ہو گئی۔ پہلے انھیں مسلمانوں کی پارٹی ملی اس نے ان کو عیسائی جانتے ہوئے بھی احتیاطاً دس پانچ جوتے مار دئے کہ سند رہیں اور وقت ضرورت کام آئیں۔ پھر ان کی خوبی قسمت سے ان کو ہندوؤں کی پارٹی مل گئی اس نے محض اس جرم میں ان کی خوب مرمت کی کہ وہ رہتے تو ہیں ہندستان میں اور نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔

کیا مطلب؟

مطلب یہ کہ اڈیٹر صاحب کی فرمائش پوری ہو گئی!

ادیب کی چند راتیں

(۱)

میں شہر میں بالکل ہی تنہا تھا۔ ایک چھوٹے سے دفتر میں ملازم اور ایک بڑی عمارت کی پشت پر ایک چھوٹے سے میلے کچیلے تاریک کمرہ میں مقیم۔ شہر کی دلچسپیاں اور لطافتیں میرے لیے کہانیاں تھیں۔ میں ان سے دُور تھا بہت دُور۔ دن بھر دفتر میں کام کرتا۔ خاموشی سے اپنی میز پر سر جھکائے ہوئے۔ شام کو گھر لوٹتے ہوئے راستہ کے ایک سستے ناشتہ گھر میں چائے پیتا اور ایک سگرٹ سُلگاتا۔ پھر اِدھر اُدھر بھیڑ سے بچتا۔ موٹر تانگوں سائیکلوں سے کتراتا دور تک نکل جاتا اور اندھیرا ہوتے ہی اپنے کمرہ میں پہونچ جاتا۔ سامنے کے ہوٹل میں سب سے کم قیمت کھانا کھاتا اور پھر سگرٹ کی ایک ڈبیا لے کر اپنے لکھنے کی میز پر بیٹھ جاتا۔ دنیا میں مجھے اگر کسی چیز سے محبت تھی تو کہانیاں لکھنے سے۔ کبھی کبھار میری کہانیاں سستے معمولی اخباروں اور رسالوں میں شایع ہو جاتیں تھیں۔ کئی دفعہ میں نے اعلیٰ طبقہ کے پرچوں میں بھی کہانیاں بھیجیں لیکن وہ ہمیشہ واپس کر دی گئیں۔ ایک دفعہ میں نے ایک نہایت ہی اچھوتے پلاٹ پر ایک ہفتہ میں ایک کہانی بڑی محنت سے تیار کی اور شہر کے سب سے زیادہ مقبول اور معیاری پرچہ کو بھیجی لیکن اڈیٹر نے اس پر نہایت

دل شکن اور مایوس کن تنقید لکھ کر بغیر کسی رسمی شکریہ کے واپس کر دیا۔ اس دن سے میں نے کبھی کوشش نہیں کی کہ میں کسی اچھے پرچہ کو اپنی کہانی بھیجوں۔ میں نے سمجھ لیا کہ میں دنیا کے تاریک پہلو کے لیے پیدا کیا گیا ہوں اور اس کے اجاگر پہلو میں میرے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ میں عموماً رات کو ایک دو بجے تک لکھتا رہتا۔ اور بعض دفعہ تو ساری رات گذار دیتا۔ میں سویرے نو بجے کے بعد سو کر اُٹھتا۔ فوراً ضروریات سے فارغ ہو کر کھانا کھاتا اور دفتر روانہ ہو جاتا۔ یہ تھی میری زندگی! مجھے تو اپنی زندگی ایک ناپیدا کنار ریگستان معلوم ہوتی ہر طرف ریت ہی ریت۔ نہ کوئی چشمہ نہ پھول نہ پتی۔ ایک ہی منظر ایک ہی تصویر۔ ہر چیز خشک، ہر شے جھلسی ہوئی، مرجھائی ہوئی۔ میں اپنی زندگی نہیں گذار رہا تھا وہ خود گذر رہی تھی۔ ایک ہی رفتار ایک ہی قسم کی حرکت کے ساتھ۔ جو کسی مشین کو بھی شرماتی۔

(۲)

جاڑوں کے دن تھے۔ آدھی رات گذر چکی تھی۔ میں لکھتے لکھتے تھک کر آنکھیں بند کیے ہوئے کرسی پر لیٹا ہوا سگرٹ سلگا رہا تھا۔ میری ادھوری کہانی جس کو میں نے آج ہی شام کو شروع کیا تھا ایک ایسی منزل پر آ کر اٹک گئی تھی جس کے آگے بڑھنا بہت ہی دشوار تھا بلکہ ناممکن نظر آتا تھا۔ کہانی کا مستقبل مجھے اپنے ہی مستقبل کی طرح تاریک اور گھناؤنا معلوم پڑتا۔ دفعتاً میں نے ایک ایسی آواز سُنی جیسے سونے چاندی کے چند ہلکے برتنوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا جائے۔ نہیں نہیں۔ یہ کسی لڑکی کا قہقہہ تھا۔ میں چونک پڑا۔ مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ قہقہہ! اور ایک لڑکی کا قہقہہ! یہاں میرے کمرے کے پاس! اور پھر اس وقت! میں مبہوت رہ گیا۔ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری ہمت نہ پڑی کہ میں دروازہ کھول کر باہر جھانک بھی سکوں۔ جس طرح اندھیرے

میں ایک لمحہ کے لیے کوندا لپکتا ہو اور پھر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہو۔ اسی طرح ٹھنڈی رات کی منجمد خاموشی میں یہ قہقہہ کھنکا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ خاموش خاموشی طاری ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ کہیں دولت وشہرت کی دیوی اس تاریک رات میں میرا مذاق اڑانے تو نہیں آئی تھی! اسی طرح میں نے کئی دوسری حماقت کی باتوں کی طرف اپنا خیال دوڑایا لیکن بعد کو ان توہمات کو نفرت سے ٹھکرا کر میں دیر تک غور کرتا رہا کہ یہ کون لڑکی تھی؟ یہ یہاں اس وقت کیسے آئی؟ کیا میں اس سے مل نہیں سکتا! جس لڑکی کا قہقہہ اس قدر پُراسرار اور پُرکیف ہو وہ یقیناً بے حد حسین ہوگی۔ اس روز اپنے بستر پر میں نے اپنے آپ کو ہر روز سے زیادہ تنہا پایا۔

دوسرے روز سویرے اٹھ کر میں نے دیکھا کہ میرے کمرے کے پاس ہی ایک زینہ ہی۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی نوجوان حسین لڑکی میرے کمرے کے اوپر دوسری منزل میں رہتی ہی اور میں یہ حسرت اپنے سینے سے چمٹائے کہ "کاش میں اس سے مل سکتا" دفتر چلا گیا۔ مجھے اپنی یہ خواہش ایسی ہی معلوم ہوئی جیسے کوئی بھک منگا جواہرات اور اشرفیوں کا خواب دیکھے!! کئی دن گذر گئے۔ میری زندگی اپنی مقررہ رفتار اور حرکت سے چلتی رہی۔ صرف میرے دل میں ایک کانٹا سا کھٹکا کیا۔

(۳)

رات کے دس بجے ہوں گے میں حسب معمول اپنے کمرہ میں لکھ رہا تھا۔ دفعتہً کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں تعجب اور خوف سے اچھل پڑا میرا دروازہ کھٹکھٹانے والا اس شہر میں کون؟ پھر کسی نے زیادہ زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "کیا مکان میں آگ لگ گئی؟" میں نے سوچا اور لپک کر دروازہ کھول دیا۔ مخمل کے زمردیں شب خوابی کے

لباس میں ایک سترہ اٹھارہ سال کی حسین اور دلفریب لڑکی کا چہرہ جگمگا رہا تھا!!

اس نے کہا "معاف کیجئے گا۔ ایک ضرورت کے لیے میں آپ کو اس وقت زحمت دینا چاہتی ہوں۔ اس نے میرے میلے کچیلے کپڑوں اور پریشان بالوں پر نظر کی اور میں جھینپ گیا۔

"فرمایئے" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے گا" اُس نے پھر کہا۔

"کوئی ہرج نہیں فرمایئے"

"آپ ڈی لگڑے سینما تک چلے جایئے۔ اور وہاں کے منیجر کو یہ خط دیجئے اور وہ جو چیز دیں اُسے لیتے آیئے۔ شہر کی سب دوکانیں بند ہو گئی ہیں"

"بہت اچھا" میں نے نہایت عاجزی سے کہا "کپڑے پہن کر جاتا ہوں۔ لیکن یہ ڈی لگڑے ہے کہاں؟" اُس نے مجھے رحم کی نگاہوں سے دیکھا پھر معصومیت سے بولی۔ "آپ میری موٹر پر جایئے گا۔ ڈرائیور بالکل ہی جاہل ہے۔ ورنہ میں اسے تنہا بھیج دیتی وہ منیجر تک نہ پہونچ سکے گا۔"

وہ چلی گئی اور میں نہ معلوم کن خیالات میں منہمک کمرہ میں جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگا۔ نہ معلوم کیوں میں نے اپنا سب سے بیش قیمت جوڑا پہنا۔ کمرہ سے باہر نکلا تو دروازہ پر موٹر کھڑی تھی ــــ

میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب سینما کے منیجر نے میرے سامنے شمپین کی دو بوتلیں رکھ دیں اور جب میں نے پوچھا "خط کا جواب" تو اس نے کہا "یہ بوتلیں لیتے جایئے یہی خط کا جواب ہے" ــــ

ڈرائیور نے مجھے میرے کمرہ کے سامنے اتار دیا۔ میں کمرہ میں داخل ہوا تو میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات اور تاثرات کا ایک بے پناہ ہجوم تھا۔ لیکن جو خیال اور تاثر سب سے زیادہ نمایاں تھا وہ یہ کہ میری خودداری کو بُری طرح مجروح کیا گیا تھا۔ یہ لڑکی یقیناً طوائف تھی —— اس نے ایک گھناؤنے کام میں مجھے اپنا شریک کار بنایا تھا۔ اس عالیشان عمارت میں مجھ ہی کو اتنا حقیر اور ذلیل سمجھا کہ اس نے گیارہ بجے رات کو شراب لینے بھیجا —— میں غریب ہوں، مفلس ہوں، دنیا مجھے ٹھکراتی ہو، روندتی ہو، لیکن میں اپنی خودداری کو اس طرح مجروح ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ کمزور کو سب دباتے ہیں۔ میری غریبی سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا۔ غیر ارادی طور سے میرے آنسو چھلک آئے۔ مجھ کو تسلّی دینے والا صرف ایک خیال تھا۔ "وہ حسین تھی بلا کی حسین" ——

(۵)

دوسرے دن رات کو پھر کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں سمجھ گیا وہی ہو گی۔ اور پھر کسی کام کے لیے آئی ہو۔ میں جانتا تھا کہ آج میں اس کو کیا جواب دوں گا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ آج عنابی لباس میں تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے یاقوتی ہونٹوں پر تبسم کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ خلاف توقع اس نے کوئی فرمائش نہیں کی۔ وہ کمرہ میں چلی آئی اور میرا میلا کچیلا تاریک کمرہ جگمگا اٹھا۔

کمرہ میں صرف ایک کرسی تھی میں نے وہ کرسی اس کو پیش کر دی۔ اور خود پاس ہی اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے چاروں طرف میرے کمرہ کو دیکھا۔ میں گھبرا سا گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس پر غصہ بھی آیا کہ یہ میری غریبی دیکھ کر دل ہی دل میں میرا مذاق اڑا رہی ہو گی۔

رُکتے رُکتے اُس نے کہا۔ "کل آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔"

میں اراداتاً خاموش رہا۔

"آپ کیا کرتے ہیں؟" اُس نے میری خاموشی سے متاثر ہوئے بغیر پوچھا۔

"میں دفتر میں ملازم ہوں۔"

"لیکن آپ رات کو اتنی دیر تک کیوں جاگتے ہیں"؟ وہ مسکرا رہی تھی۔

"مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق ہے۔"

"آپ کہانیاں لکھتے ہیں۔ کہانیاں! سچ!" وہ واقعتاً متعجب تھی۔

مجھے اس کے معصوم تعجب پر رحم آیا۔ "جی ہاں۔ اور آپ کیا کرتی ہیں۔؟"

اُس نے اپنا ساحرانہ قہقہہ لگایا۔ "آپ کہانیاں لکھتے ہیں۔ میں کہانیاں بناتی ہوں۔" وہ ہنس رہی تھی۔ اور اس کی بیباک ہنسی پر میں محجوب ہو گیا۔

"لیکن کہانیاں لکھنا کہانیاں بنانے سے مشکل ہے۔" میں نے ایک غیر ضروری مبہم سی بات کہی۔

"یہ آپ جانیں ــــ لیکن آپ کہانیاں لکھ کر کیا کرتے ہیں؟ آپ نے تو ہزاروں کہانیاں لکھ ڈالی ہوں گی۔ آپ ان کو اخبارات میں بھیج دیتے ہیں؟ اخبارات آپ کو اس محنت اور مشکل کام کی اُجرت نہیں دیتے؟" میں نے محسوس کیا اس کو مجھ سے ہمدردی ہے۔

"میں اپنا سارا وقت صرف کہانیاں لکھنے پر نہیں صرف کرتا۔ کہانیاں پڑھتا بھی ہوں۔ میں ایک ایک کہانی کو کئی کئی بار لکھتا ہوں۔ اس میں بڑا وقت ضایع ہوتا ہے۔ اخبارات کو میں سب کہانیاں نہیں بھیج دیتا۔ سب بھیجوں تو چھاپے کون؟

بڑی بے قدری کا زمانہ ہی۔ زیادہ تر کہانیاں تو میں لکھ کر اپنے بکس ڈال دیتا ہوں میرے جلے ٹوٹے پھوٹے تھے۔

"تو جو کہانیاں آپ اخبارات میں بھیجتے ہیں اُن کی کچھ اُجرت بھی ملتی ہی"؟

"اُجرت"؟ میں ایک تلخ ہنسی ہنسا۔ وہ سمجھ گئی۔

"اچھا میں آپ کی کہانیاں خریدوں گی" اُس نے مسکرا کر کہا۔

"آپ"؟ آپ ان کو لے کر کیا کیجئے گا"

"میں ان کو اپنے نام سے شایع کراؤں گی"

"اچھے اخبارات ان کو نہیں شایع کریں گے"

"اچھے اخبارات؟" اس نے طنز سے کہا۔ "آپ سے کیا مطلب"؟

میں خاموش رہا۔

"آپ نے اپنی کہانیوں میں کیا لکھا ہی؟" — اُس نے پوچھا۔

"زندگی کی وہ رنگینیاں اور ستم ظریفیاں جن سے میں اپنی اصلی زندگی میں محروم ہوں اور جو مجھے صرف اپنے خوابوں میں نظر آتی ہیں۔"

"سچ! تو وہ عجیب چیز ہوں گی۔ میں ان کو ضرور لوں گی" اس کا اشتیاق بالکل طفلانہ تھا۔

وہ رات کو دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ وہ اٹھی تو اس کے ہاتھ میں میری کیس کہانیاں تھیں۔ اور میرے ہاتھ میں دوسو روپے کے نوٹ! مجھے اپنے کانوں اور آنکھوں پر اعتبار جاتا رہا۔ رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ سویرے تک وہ نوٹ میری مٹھی ہی میں رہے۔

(۶)

دوسرے روز وہ پھر آئی۔ آج تجارتی بات چیت نہ تھی۔ وہ بستر پر میرے پاس بیٹھ گئی۔ اُس نے میری سگریٹ سلگائی۔ اُس کے پوچھنے پر میں نے اُسے اپنی پوری آپ بیتی سنائی۔ وہ ہمدردی سے بڑی دیر تک میرا منھ تکا کی۔ وہ جانے لگی تو میں کھڑا ہوگیا۔ میرا تکیہ گر پڑا تو اُس نے فوراً اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے مس ہوگیا۔ اس نے اپنا نام بتایا "شمیم"

(۷)

اب وہ روز آتی۔ آخرکار میری زندگی کے دھندلے تاریک افق پر ایک چمکتا اور، تڑپتا ہوا ستارہ نمودار ہوگیا۔ وہ طوائف نہیں تھی وہ صرف ایک ناچ گھر میں ملازم تھی۔ اس کی ماں ایک شریف عورت تھی۔ لیکن وہ اب اس دنیا میں نہ تھی باپ کا باپ آوارہ تھا جس کو شراب پینے کی بے انتہا لت تھی۔ شمیم خود شراب نہ پیتی۔ اُس روز اس کے باپ ہی نے شراب منگائی تھی اور منیجر کے نام اسی نے خط لکھا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے بیزار تھی۔ وہ بھی میری ہی طرح اکیلی تھی۔ بالکل تنہا!! وہ ناچ گھر میں اسی طرح اجنبیت محسوس کرتی تھی جس طرح میں دفتر میں ——

میری زندگی نے ایک بالکل نیا پلٹا کھایا۔ مجھ میں تنہائی اور بے مقصد زندہ رہنے کی وجہ سے جو وحشیانہ انداز پیدا ہونے لگے تھے وہ رفتہ رفتہ زائل ہونے لگے میری آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ میری رگوں میں بھی تازہ اور گرم خون دوڑ رہا ہے —— وہ روز آتی۔ اس کے شروع کے تبسم اب قہقہوں میں تبدیل ہوگئے تھے۔ اب میں بھی اس کی موجودگی میں اپنے آپ کو اجنبی نہ تصور

کرتا، اور تول تول کر اور زبان کو روک روک کر بات نہ کرتا۔ اکثر میں بھی اُس کے قہقہوں میں شریک ہوتا۔ دفتر میں اب میرا سارا دن آنے والی رات کی خوش آئند ملاقات کے تصور میں صرف ہوجاتا۔ میرا دن رات کو ہوتا ــــ جب ساری دنیا کی نظروں سے آفتاب اوجھل ہوجاتا تو وہ رات کو میرے کمرہ میں نمودار ہوتا۔

(۸)

ایک روز وہ آئی ہنستی ہوئی لجاتی ہوئی۔ اُس نے آتے ہی پوچھا۔

"آپ نے کوئی نئی کہانی نہیں لکھی؟"

"لکھی ہیں کئی۔ پہلے سے کہیں زیادہ حسین۔ نرم و نازک۔ شاداب۔"

"تو پھر لائیے۔"

"وہ پہلی کہانیاں تم نے کیا کیں۔ مجھے سخت شرمندگی ہو کہ ہماری تمھاری ملاقات خرید و فروخت سے شروع ہوئی۔ تمھارا روپیہ رکھا ہی۔ لاؤ مجھے میری کہانیاں واپس کر دو۔"

اُس نے جھوم جھوم کر قہقہہ لگایا۔ اور دیر تک ہنستی رہی۔

"اب رکھی ہیں آپ کی کہانیاں؛ وہ شایع بھی ہوگئیں۔"

"شایع ہوگئیں۔ کیسے!"

"اعلیٰ طبقہ کے بہترین اخبارات میں۔"

"سچ"

"اور کیا؟" وہ پھر ہنسی۔

"تو پھر تمھیں کیا حاصل ہوا؟"

"اب جس روز میرا ناچ ہوتا ہے ہال میں ایک نشست بھی خالی نہیں ہوتی۔ اشتہاروں میں شایع ہوتا ہے ملک کی مایہ ناز ادیبہ مس شمیم کا ناچ ہوگا سنیما کے منیجر سے میں نے زبردستی اپنی تنخواہ میں سو روپیہ کا اضافہ بھی کرا لیا ہے" وہ ہنس ہنس کر کہہ رہی تھی۔ میں سر جھکائے خاموش تھا ــــ آہ ایک مصنف کی نعش پر ایک رقاصہ ناچ رہی تھی!

قصور میرا ہی تھا۔!

"اور لاؤ کہانیاں! دُگنی قیمت پر" ــ وہ پھر بولی۔

"اب نہیں!"

"اب نہیں کے کیا معنی" ــ وہ جھنجھلا سی گئی۔

"شمیم! میری کہانیاں میرے دل و دماغ کے بہترین ٹکڑے ہیں۔ میری ساری زندگی کا وہی حاصل ہیں۔ میں ان کو نہیں بیچ سکتا! ایک دفعہ میں نے غلطی کی حماقت کی ضمیر فروشی کی۔ اب نہیں! میری کہانیاں میرے بچے ہیں۔ کیا کوئی باپ اپنے بچوں کو فروخت کرتا ہے؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ وہ خاموش ہوگئی۔

(۹)

ایک روز میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "شمیم" "کیا ہم لوگ ہمیشہ اسی طرح ایک ساتھ نہیں رہ سکتے" اس کا شگفتہ چہرہ کمہلا سا گیا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر بولی۔ "محبت ایک خواب ہے اور بھوک ایک حقیقت!"

میں سب کچھ سمجھ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ خود بھی بہت زیادہ

متاثر تھی۔

(۱۰)

کچھ دنوں بعد اُس شہر سے میرا تبادلہ ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی کہیں چلی گئی۔

بچے

"بچے پیدا کیجیے" یہی ہماری قوم کا نعرہ جنگ ہے۔

کچھ فکر نہیں اگر وہ لولے لنگڑے، اندھے، کوڑھی، جذامی ہیں۔ آپ صرف بچے پیدا کئے جائیے اور ضبط تولید کے رسوائے عالم اصول کی دھجیوں پر دھجیاں اڑائے جائیے۔ یہی ملک و قوم کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ اسی سے مذہب کا بول بالا ہے۔ اور یہی عاقبت میں آپ کی نجات کا واحد ذریعہ ہے۔

بچے! بچے۔ بچے! ہر ٹائپ اور ہر سائز کے بچے، ہندو بچے، مسلمان بچے۔ کالے بچے۔ گورے بچے۔ بلکتے بچے۔ ضروریات زندگی سے فارغ ہوتے ہوئے بچے! ہر قسم اور ہر ڈھب کے بچے! بس بنائے جائیے اور انھیں سڑک کی نالیوں میں کھیلنے کے لیے چھوڑ دیجیے۔ ! آپ کا فرض پورا ہو گیا۔

کوئی پرواہ نہیں اگر آپ مستقبل کو بہت بھیانک اور ہیبت ناک سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کے بچوں کو جوان ہو کر ریل کی پٹریوں پر جان دینے کے لیے لیٹنا پڑے ممکن ہے کہ آپ کے بچوں کے ذخیرہ کا ایک بیش بہا حصہ پاگل خانے کی نذر ہو جائے۔ ممکن ہے کہ آپ کے بچے بوجہ نہ ہونے ذریعہ معاش کے حوالات میں بند کر دئے جائیں۔ ممکن ہے کہ آپ کے کوڑھی اور جذامی بچے سسک سسک کر خیراتی ہسپتال میں جانیں دے دیں۔ لیکن اس سے

کیا؟ کیا یہ شکوک اور شبہات آپ کے توکل ایمانی کو ٹھیس نہیں پہونچاتے؟ کیا یہ شیطانی وسوسے اس زرین اصول کی کہ "جس نے پیٹ بنایا ہے وہ پیٹ بھرے گا بھی" خلاف ورزی نہیں کرتے؟ کیا اس قسم کے گمراہ کن اور فتنہ انگیز خیالات آپ کو اپنے خالق کی بہترین عبادت یعنی بچے پیدا کرنے میں مخل نہیں ہوتے؟ چھوڑیئے ان کو اور دور بھگایئے ان سے! آنکھوں پر پٹی باندھ لیجیے اور کانوں میں انگلیاں دے لیجیے اور لگ جایئے اپنے نیک اور مبارک کام میں یعنی بس پیدا کیے جایئے۔ بچے! بچے! بچے!

خود ہی غور فرمایئے کہ اگر خدانخواستہ کل آپ اس خدمتِ ربانی سے دست بردار ہو جایئے یعنی بچے پیدا کرنا بند کر دیجیے۔ یا نعوذ باللہ من ذالک بچے پیدا کرنے کی مشین میں برک لگا دیجیے تو دنیا کا کیا حشر ہو؟ "انقلاب زندہ باد" کے نعروں کے بجائے دن دہاڑے الو بولنے لگیں! اور پھر آپ ہی بتایئے کہ اگر اسلام خطرہ میں پڑ جائے یا ہندو دھرم کی لاج کا سوال آ جائے یعنی کوئی تیرہ بخت مسلمان کسی گائے کی دم پکڑ کر کھینچ لے تو کیا ہو؟ نہ ہوں اگر آپ کے بچے تو کون آڑے آئے آپ کے مذہب کے؟ اور پھر ہم تو سولہ آنہ انقلابی واقع ہوئے ہیں۔ اور ہماری ناقص رائے میں ضبط تولید کا اصول محض سرمایہ داروں کا ایک فریب ہے۔ ورنہ انقلاب اور مکمل آزادی کے لیے تو زیادہ سے زیادہ بچوں کی ضرورت ہے ——

اب کہاں تک اس بحث کو آگے گھسیٹوں۔ مجھ سے بہتر آپ خود سمجھتے ہیں۔ بس کیے جایئے پیدا بچے: بچے! بچے! بچے جب باقی ہوش!—

میرا ایک دوست مشرف تھا۔ عرصہ ہوا جب میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ لیکن اس کی کم عمری ہی میں اس کے والدین اس کی بیکاری سے تنگ آ گئے اور اسے بچہ بنانے کی

فیکٹری میں ملازم رکھا دیا یعنی شادی کردی۔ بیچارے کو اپنے کام ہی سے فرصت نہ ملتی جو ہمارے ایسے پرانے یار دوستوں سے ملتا چناں چہ پندرہ سال ہو گئے اور میں اس کی صورت نہ دیکھ سکا۔ ایک دفعہ بریلی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہیں مشرف کا مکان تھا میرے دل میں پرانی دوستی کی ہوک اٹھی اور اس سے ملنے اس کی کوٹھی پر چلا گیا۔

جیسے ہی کوٹھی کے حاطہ میں قدم رکھا میں نے دیکھا کہ بچوں کا ایک چمن زار کھلا ہوا ہے۔ ہر سائز اور ہر وضع قطع اور ہر چہرہ مہرہ کے بچے۔ گویا بچوں کی کوئی نمائش ہو یا عجائب خانہ ہو یا دوکان ہو۔ ادھر اُدھر پھُدک رہے تھے۔ اور اپنے شور وغل سے سارے محلہ کو سر پر اٹھائے ہوئے تھے معلوم ہوتا ہو جیسے ابھی ابھی یہ فتح یاب ہو کر محاذ جنگ سے پلٹے ہیں۔ کوئی کسی کے کان دباتا، کوئی کسی کے چپت مارتا، کوئی خود اپنے بال کھسوٹ کھسوٹ کر رو رہا تھا۔ کوئی ایک ٹانگ سے اُچک رہا تھا۔ کوئی اوندھا اوندھا لیٹا گھاس کھا رہا تھا وغیرہ وغیرہ۔ پہلے میں ٹھٹکا کہ شاید غلطی سے بچوں کے کسی پاگل خانے میں پہونچ گیا ہوں۔ لیکن پھر ہمت کر کے مجبوراً آگے بڑھا۔ اس شیطانی فوج نے مجھے قابل اعتنا نہ سمجھا صرف ایک دفعہ میری تالی پیٹی "لُولُو ہو لُو لُو ہو"۔

مشرف سے ملاقات ہوئی وہ بیچارہ سرتاپا خیر مقدم بن گیا۔ وفور محبت سے لپٹ گیا۔ میں نے سب سے پہلا سوال یہی کیا "ماشاءاللہ یہ بچے تمہارے ہیں"۔

انکساری میں مشرف ریشہ خطمی بن گیا۔ "میں کس قابل ہوں۔ خدا کی دین ہو"

میں نے وہی اب سے پندرہ سال پیشتر کا طرز اختیار کیا۔ "کیا مطلب؟ جھینپتے کیوں ہو۔ بتاؤ تو یہ کس کے بچے ہیں؟"

"خدا کے بندے ہیں" مشرف بولا

"ارے ان بچوں کو تم نے پیدا کیا یا نہیں؟"

مشرف اس مذاق سے بڑا لطف حاصل کر رہے تھے۔ اور مجھے جھنجھلاہٹ معلوم ہوتی۔ "خدا نے بنایا ہو ان کو!"

میں نے پوچھا۔ "اچھا یہ کوٹھی کس نے بنوائی ہے؟"

کہنے لگا "میں نے"

"معمار کا تو اس میں کوئی ہاتھ نہیں؟"

ہنس کے بولا "بنائی اُس نے بنوائی میں نے"

میں نے کہا "نیک بخت اسی طرح بچوں کے متعلق بھی جلدی سے بتا دے"

ابھی گفتگو یہیں تک پہونچی تھی کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے پشت کی دیوار میرے سر پر گر پڑی —— نہیں کوئی زبردست ضرب میری گدی پر لگائی گئی تھی۔ تیس برس بعد مجھے میرے مولوی صاحب کی یاد تازہ ہوگئی۔ پیچھے گھوم کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ کچھ نہیں تھا۔ یہ صرف مشرف کے ایک سات آٹھ سال کے بچے کا اظہار مسرت تھا۔ میری گھبراہٹ پر بچہ کھلکھلا اٹھا اور تالیاں بجانے لگا۔ مجھے غصہ تو اس قدر آیا کہ ذرا نہ ہوتا تو میں بچہ کو اٹھا کر ٹپک دیتا۔ لیکن میں نے ازراہ اخلاق بچہ کو گود میں اٹھا لیا۔ تھوڑی دیر تک وہ بچہ میری گود میں تڑپا کیا۔ لیکن پھر ایک دم سے جیج کر میری پہونچ سے باہر نکل گیا۔ اور بھاگا۔ دروازہ کے قریب پہونچ کر اُس نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ کھول کر کہا "یہ!" میرا فاونٹن پن اس کی ہتھیلی پر چمک رہا تھا۔ اور قبل اس کے کہ میں یا مشرف اپنی جگہ سے حرکت بھی کر دیں، وہ نو دو گیارہ ہوگیا۔

مشرف نے مجھے تسلی دی کہ "ابھی منگائے دیتا ہوں قلم" اور میں قہر درویش

بہ جان درویش کے مصداق خاموش ہو گیا۔ ابھی میں اس حادثہ سے اچھی طرح جانبر بھی نہ ہونے پایا تھا یعنی یہ کہ اپنی جھینپ مٹا کر کوئی بار بط گفتگو نہ کرنے پایا تھا اور شاید اس قسم کے کسی جملہ پر تھا۔ " دنیا میں بعض ایسے ناگہانی حادثات پیش آتے ہیں کہ جس کے متعلق انسان اپنے آپ کو بالکل بیکس اور بے بس پاتا ہے ...... کہ دفعتاً میرے سر پر پھر ایک بھرپور گرز پڑا اور اس دفعہ اس کی شدت اور حدت اس قدر زیادہ تھی کہ میری ٹوپی داغ مفارقت دے گئی۔ اور وہ ہوا میں اُڑتی نظر آئی ......

....

قبل اس کے کہ میں اپنے ہوش وحواس بجا کر سکوں۔ اور اپنی ٹوپی اُٹھا سکوں کہ نہ معلوم کہاں سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ اور اُس نے جھپٹ کر میری ٹوپی اٹھائی اور بھاگا ......

اب میرا پیمانہ صبر چھلک چکا تھا! میں نے نہایت غصہ سے مشرف کی جانب دیکھا۔ وہ بدستور ایک نیاز مند باپ کی طرح ہنس رہے تھے اور باوجود اس کے کہ بچے اُن کی آواز کی پہونچ سے باہر تھے نہایت لطافت کے ساتھ کہہ رہے تھے " بُری بات! اچھا ہیں یہ تمھارے! کہیں اچھے لڑکے کسی کی چیز لیتے ہیں۔ ! " گویا چپت مارنا اور اس زور سے مارنا تو عین سعادت مندی تھی۔

میں نے نہایت بے مروتی سے مشرف سے مطالبہ کیا۔

" میاں وہ قلم اور ٹوپی تو لا دو! "

کہنے لگا " بچے ہیں ابھی کھیل کر لے آئیں گے! " ......

میرا ایسا مجروح انسان اس فلسفہ عمرانیات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے

پھر کہا "لاؤ اب چلا۔ زندگی رہی تو شام کو پھر ملاقات ہوگی۔"

بڑی بیزاری سے مشرف اپنی جگہ سے ہلے۔ اور آدھ گھنٹے تک غائب رہے۔ اس عرصہ میں بچوں نے کئی دھاوے بولے۔ اور میں اگرچہ کتا اور ہوشیار نہ رہتا تو شاید آج یہ مضمون قلمبند نہ کر رہا ہوتا۔

مشرف آئے تو ایک پھٹی ہوئی ٹوپی لے کر۔ جو میری نئی مخملی ٹوپی کی محض ایک فرسودہ یادگار تھی۔ اور ہنس کر کہنے لگے "بڑے شیطان ہیں یہ بچے۔ قلم کو نہ معلوم کہاں بو دیا ہے کہتے ہیں درخت نکلے گا تو اس میں بہت سے قلم نکلیں گے۔ اور ٹوپی کو بکری کے بچے کو نوس کی طرح کھلا رہے تھے۔ میں نہ جاتا تو شاید کھلا بھی دیتے۔"

میں خاموش بیٹھا رہا اور مشرف ہنستے رہے۔ "میں تمھارے لیے اپنا قلم لائے دیتا ہوں۔ اور یہ ٹوپی بھی بدلے دیتا ہوں۔"

میں نے ایک تلخ ہنسی ہنس کر کہا "کیا ضرورت ہے؟ بچے تو آخر بچے ہی ہیں۔"

میں چلا آیا۔ حاطہ میں بچے اپنی ماں کا ایک پائجامہ گدھے کے ایک چھوٹے سے بچے کو پہنا رہے تھے۔ لیکن میں تصحیح عرض کرتا ہوں آپ سے کہ مجھے وہ بچے قابلِ رحم معلوم ہوتے تھے۔ میرا جی چاہتا کہ ان سے لپٹ کر خوب روؤں!! ——

قُلی نمبر ۳۹۹

دسمبر کا مہینہ، گلابی جاڑے، چار بجے صبح کا وقت، لکھنؤ کا بارونق اور عالی شان چارباغ اسٹیشن ایک مفلس کی کوٹھری کی طرح سنسان اور ویران تھا۔ آخری گاڑی ۲ بجے آ چکی تھی۔ اور اس کی روانگی کے بعد پلیٹ فارم کی وہی کیفیت تھی جو عموماً میّت دفن ہو جانے کے بعد قبرستان کی ہوا کرتی ہو۔ صرف کہیں کہیں پر بجلی کے بڑے بڑے قمقمے کسی فرعون بے سامان کی چشم عتاب کی طرح شعلہ فگن تھے۔ لیکن اندھیرے کے بے پایاں طوفان بغاوت میں بالکل ہی بے بس اور مجبور! ادھر اُدھر کسی گوشہ میں یا کسی دروازے پر یا پُل کے نیچے یا سُرنگ کے اندر ایک آدھ پرچھائیں چلتی پھرتی یا سرگوشیاں کرتی بھی دکھائی دیتی۔ لیکن پھر—— ہر طرف خاموشی۔ بے حسی اور تاریکی تھی——

دن بھر اور نصف رات سے زیادہ تک دوڑنے ہانپنے۔ اُچکنے اور چیخنے والا قلی بھی جامد و ساکت ہو چکا تھا۔ پتھریلا فرش اُس کا گدّا تھا۔ اور ٹین کا سائبان اُس کا لحاف اُس کے تھکے ہوئے جسم کی بے خبر نیند موسم کی تندی اور تیزی سے انتقام لے رہی تھی۔ پلیٹ فارم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک قطار در قطار بے شمار قلیوں کی سوتی ہوئی نعشیں بکھری پڑی تھیں۔ معلوم ہوتا جیسے کسی میدان جنگ میں

یہ سب کھیت رہے ہیں۔ اور واقعی کارزارِ حیات میں یہ سب مقتول ہی تھے! مال گودام کے آہنی پھاٹک کے دائیں جانب ایک بڑا سا ٹھیلا بوریوں اور بوروں سے بھرپور خوب لدا پھندا کھڑا تھا۔ اور اس کے عین وسط میں عبداللہ قلی نمبر ۳۹۹ اطمینان سے پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ بڑی مدت کے بعد اس کو ایسی آرام کی جگہ سونے کو نصیب ہوئی تھی۔ آغوشِ مادر یا پہلوئے جاناں کا مزا آ رہا تھا۔ بس مصیبت صرف یہ تھی کہ بورے کپڑے کی گانٹھوں کے تھے۔ ردّی یا پیال کے نہیں۔ دفعتاً گھڑیوں نے پانچ بجائے۔ کہیں کہیں دو چار لوگ بھی نمودار ہوئے۔ پرچھائیوں نے انسانوں کی شکل اختیار کرنا شروع کر دی۔ آٹھ دس کمروں کی بتیاں بھی جل اٹھیں۔ اسٹیشن کے باہر یکے اور تانگے کھڑکھڑانے لگے۔ پانچ سات مسافر بھی آ گئے۔ اور شاید ان کی بو سونگھتے ہی قلی بھی انگڑائیاں لے کر اٹھنے لگے۔ کھانسنے اور بلغم نکالنے کی آوازیں واضح طور سے سنائی دینے لگیں۔ پھر یک بیک بڑی زور سے گھنٹہ بجا اور سارے پلیٹ فارم پر ایک ہلچل سی مچ گئی " اینٹین اپ آ رہا ہے۔" کا شور بے ہنگام بلند ہوا۔ " ہندو چائے "، " مسلم بسکٹ "، " چھریاں چاقو بکاؤ "، " کچالو گرم گرم مسالہ دار " " ریوڑیاں لکھنؤ کی " وغیرہ وغیرہ اور اسی طرح کے دوسرے نعروں نے سارے پلیٹ فارم کو سر پر اٹھا لیا۔ چھک چھک، ٹنٹ ٹنٹ، شائیں شائیں کرتی گاڑی بھی آ گئی اور سارا اسٹیشن مع اپنے ٹین اور لوہے کے متزلزل ہو گیا۔

گھبرا کر اپنی دھوتی سنبھالتا عبداللہ بھی دوسرے قلیوں کی طرح گاڑی پر جھپٹا لیکن گاڑی قریب قریب بالکل ہی خالی تھی۔ صرف آٹھ ہی دس مسافروں نے اترنے یا چڑھنے کی زحمت گوارا کی۔ اور وہ بھی تقریباً " بقلم خود " ہی تھے۔ یعنی ان کے پاس اسباب تھا ہی نہیں۔ اور تھا بھی تو صرف اس قدر کہ قلی کی ضرورت نہ تھی۔ البتہ

ایک موٹے سے لالہ صاحب نے غضب کر دیا۔ صرف ان کو اپنی توند کو سنبھالنے کے لیے دو تین قلیوں کی ضرورت تھی۔ لیکن انھوں نے مع اس توند کے اپنے چار بڑے بڑے صندوق اور ایک بستر پلیٹ فارم سے درجہ میں اٹھا کر رکھ دیا۔ سارے قلی انھیں خون کی آنکھوں سے دیکھا کیے۔ لیکن وہ اطمینان سے بیٹھے ایک پیسے کی "ہندو چائے" خرید کر اس کے چٹخارے بھرا کیے۔

عبداللہ ایک زنانہ انٹر کے ڈبہ کے سامنے کھڑا اپنی آنکھیں سینکتا رہا۔ گارڈ نے سیٹی دی اسٹیشن کا گھنٹہ بجا۔ گارڈ نے سبز روشنی دکھلائی اور بھک بھک کے دو تین جھٹکوں کے ساتھ گاڑی رینگنے لگی۔ دفعتاً پلیٹ فارم پر سے ایک نوجوان لڑکا اور اس کے پیچھے ایک خوبصورت سی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور یہ دونوں چلتی ہوئی گاڑی کے ایک ڈبہ میں گھس گئے۔

گاڑی تیز ہو گئی۔ اور اس کی پشت کی سرخ روشنی چمکتی اور جھلملاتی ہوئی افق پر بے تھاہ سیاہی میں غرق ہو گئی ——

ڈرامہ کے اس آخری ڈراپ سین سے عبداللہ کے منجمد خون میں بھی تھوڑی سی حرارت پیدا ہو گئی۔ لیکن پھر اسی طرح جس طرح کہ گاڑی کی سرخ روشنی چمکتی اور جھلملاتی ہوئی افق پر بے تھاہ سیاہی میں غرق ہو گئی تھی یہ ہلکی سی حرارت بھی اپنے احول کے انجماد میں تحلیل ہو گئی ——

ہر کرشن قلی نمبر ۲۲۴ نے کہا۔ "دیکھی چھلکس"

ننھو قلی نمبر ۱۵ نے عبداللہ کے کہنی مارتے ہوئے کہا۔ "واہ مولوی صاحب واہ! دیکھتے ہی رہ گئے! نوچ لیا ہوتا لیک کر۔"

بھگوان دین قلی نمبر ۳۸ نے قہقہہ لگایا۔ "آشنائی کے پھن تو دیکھو۔ جان تک کا خوف نہیں۔ اور اگر پھسل جاتا بیرے"۔ عبداللہ کچھ نہ بولا اور خاموشی سے اپنے ٹھیلے پر واپس چلا گیا۔ اس نے نیند بلانے کی پھر کوشش کی۔ لیکن نہ معلوم کیوں اس وقت اس کے خیالات بھکے ہوئے تھے۔ اور وہ سو نہ سکا۔ دو تین دفعہ وہ کھانسا۔ دو تین دفعہ اس نے کروٹیں بدلیں۔ لیکن اسے کسی کل چین نہ پڑا۔ آخر کار وہ اٹھ بیٹھا۔ اور کلیٹ سے سگار کا ایک چھوٹا سا جلا ہوا ٹکڑا نکالا اور چائے والے کی انگیٹھی سے سلگا کر پینے لگا سگار کا ٹکڑا بہت جلد اپنی عمر طبعی کو پہونچ گیا بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ اور عبداللہ نے ناچار اس کو پھینک دیا۔ اور اپنی ناک اور حلق صاف کرتا ہوا پھر بوروں پر آکر پڑ رہا۔

اب سویرا ہو رہا تھا اور پلیٹ فارم پر کافی لوگ چل پھر رہے تھے۔ جگہ جگہ پر انگیٹھیوں کے گرد قلیوں کے جٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور کہیں کہیں پر رعایتی نرخ پر چائے بھی پی جا رہی تھی۔ عبداللہ نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ عجیب سی سستی اور تھکاوٹ معلوم ہوئی اور وہ پھر پڑ رہا۔

دو چار مسافر باتیں کرتے ہوئے، عبداللہ کے ٹھیلے کے پاس سے گذرے۔ اُن میں سے ایک کہہ رہا تھا "کل میں گھر پہونچ جاؤں گا۔ وہ بڑی بے چینی سے میری منتظر ہو گی"۔ اس چھوٹے سے جملے نے عبداللہ کے دل و دماغ پر نشتر کا کام کیا۔ اس کے جذبات اور ہیجانات پلے بھیڑے کی طرح بے نکلے۔ ماضی کی غمناک فضا نے اُس کے حواسِ خمسہ پر اپنی سیاہ چادر ڈال دی۔

عبداللہ قلی نمبر ۳۹۹ کا بھی ایک گھر تھا۔ صوبہ بہار کے ایک غیر معروف ضلع کی چھوٹی سی تحصیل کے ایک گمنام گاؤں میں۔ عبداللہ جواب سات سال سے لکھنؤ اسٹیشن پر قلی تھا اس نے اپنی زندگی کے پچیس سال اسی گاؤں کے کھنڈروں، سوکھے ہوئے کھیتوں، ویرانوں، اور ببول کے درختوں کے درمیان گذارے تھے۔ یہاں نہ لکھنؤ کے کچالو تھے نہ "مسلم چائے" اور نہ سگار اور سگرٹوں کے ٹکڑے۔ یہاں صرف بھرے کی روٹی تھی۔ میتھی کا ساگ، اور خوب کھٹا دہی۔ لیکن یہاں کچھ اور بھی تھا۔ جوانی اور بندا۔ اور اندھیری راتیں اور پیپل کے بڑے بڑے تنا ور درختوں کے جھنڈ!!

بندی عرف بندا گاؤں کے کھیا امجد خاں کی لڑکی تھی! اس کے اور عبداللہ کے مکان کے بیچ میں صرف ایک چھوٹی سی کچی دیوار تھی۔ جس کو اکثر پھاند کر ایک گھر کی عورتیں دوسرے گھر میں آیا جایا کرتیں۔ بندا اور عبداللہ بچپن میں ساتھ ہی کھیلے کودے اور پھر ساتھ ہی جوان بھی ہو گئے۔ بچپن اور جوانی آپس میں خلط ملط ہی سی تھی۔ اور ان کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہ تھی ـــــــــ دو بچوں نے ایک روز اپنے کو مرد اور عورت پایا۔ یوں تو بندا چودہ پندرہ سال کی عمر سے پردہ میں بیٹھ گئی تھی لیکن عبداللہ سے کوئی پردہ نہ تھا۔ وہ تو ایک گھر ہی میں رہتا اور "ابو بھائی" تھا۔

عبداللہ جوانی کی ترنگ میں بالکل ہی کاہل اور مجہول تھا۔ اور کام کرنے سے جی چراتا۔ اس کا باپ سدا کا روگی۔ اپنے چھپر میں بیٹھا ہر وقت کھانسا کرتا۔ بڑا بھائی بڑی محنت اور کوشش سے گھر کی کھیتی سنبھالتا۔ لیکن تب بھی نہ تو پیٹ بھر روٹی ہی نصیب ہوتی اور نہ زمیندار کا لگان ہی پار لگائے لگتا۔ عبداللہ کی بھاوج بھوک سے تنگ آتی تو اس کو اور اس کے باپ کو کوسنے لگتی ـــــــــ

امجد خاں کی بھی بڑی تنگی اور ترشی سے بسر ہو رہی تھی۔ لیکن ان کو اپنی سب پریشانیوں سے زیادہ بندا کی شادی کی فکر تھی۔ شروع شروع میں تو جب بندا شادی کے قابل ہوئی تو اس کے دس پندرہ پیغام آئے۔ لیکن جب سے لوگوں میں یہ سن گن ہو گئی تھی کہ اس پر ضلعدار صاحب بہت مہربان ہیں اور اپنے یہاں کام کاج کے لیے اکثر جبراً بلا لیتے ہیں تو پھر کوئی شخص بھی شادی کے پیغام کے لیے بھول کر بھی اس کا نام نہ لیتا تھا۔ جوان لڑکی گھر میں بیٹھی تھی اور جوار بھر میں بدنامی ہو رہی تھی۔ یہ غم امجد خاں کو زندہ درگور کیے ہوئے تھا۔ اور وہ کسی کو منھ نہیں دکھا سکتے۔ اس بات سے بندا اور عبداللہ کو بھی بڑی تشویش تھی۔ لیکن وہ کیا کر سکتے۔

ایک روز امجد خاں نے عبداللہ کو بلایا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد نہایت رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگے "بیٹا میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن خبردار جو اسے اپنے سے باہر نکالا" اور اسی طرح سے بہت سے تمہیدی اور تاکیدی جملوں کے بعد امجد خاں نے عبداللہ کو اپنے دل کا راز یہ بتایا کہ اگر وہ دو چار پیسے کمانے لگے تو وہ بندا کی شادی اس کے ساتھ کر دیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! عبداللہ کبھی خواب میں بھی یہ سبز باغ نہ دیکھ سکتا۔ مارے خوشی کے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس طرف دو چار مہینوں سے اس کے بھائی اور بھاوج بھی اسے بہت جلی کٹی سنا رہے تھے اور اس کی زندگی کو اجیرن کر دیا تھا۔ اب جو امجد خاں نے یہ تازیانہ لگایا تو وہ اور بھی گاؤں سے باہر جانے اور قسمت آزمائی کے لیے تیار ہو گیا۔

دو تین روز بندا سے رخصت ہونے میں لگے۔ بندا نے نہ معلوم کیا کچھ

منتیں اس کے لیے مانگ ڈالیں۔ وداع کا آخری وقت دونوں کے لیے بہت ہی نازک تھا۔ عبداللہ نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور کمر ہمت باندھ کر گاؤں کے باہر چل کھڑا ہوا۔ گاؤں سے ۱۵ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ عبداللہ اسٹیشن پہونچتے ہی سب سے پہلی گاڑی میں بلا ٹکٹ سوار ہو گیا۔

راستہ میں وہ دو چار دفعہ گاڑی سے اتار دیا گیا۔ اور ابھی خاصی اس کی مرمت بھی ہوئی لیکن وہ باز نہ آیا ــــ بالآخر لکھنؤ اسٹیشن پر وہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے کپڑے چھین لیے گئے اور وہ حوالات میں بند کر دیا گیا۔ آٹھ دس روز تک وہ حوالات میں بند رہا۔ لیکن پھر نہ معلوم کس کو اس پر ترس آ گیا اور وہ نہ صرف چھوڑ دیا گیا بلکہ قلی نمبر ۲۹۹ بنا دیا گیا۔ اس وقت سے آج تک وہ قلی بنا ہوا تھا۔

ہماری دنیا میں یہ فیصلہ تو ہو گیا کہ انسانوں کی طرح مچھر کی بھی ناک ہوتی ہو۔ اور لوہا بھی سانس لیتا ہو۔ لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ قلی بھی ایک انسان ہو یا محض بار برداری کا ایک جانور! ــــ اور اس فیصلہ کی ضرورت بھی کیا ہے؟ کون بیوقوف باور کر سکتا ہو کہ اسباب کے الٹ پلٹ اور خراب کر دینے والے۔ مسافروں سے ہر دم لڑنے جھگڑنے والے۔ اور آپس میں ہر دم دھینگا مشتی کرنے والے قلی کے بھی دل اور دماغ ہوتا ہو۔ اس میں بھی کبھی جذبات کی لہر اور جوانی کی ترنگ اٹھتی ہو اور وہ بھی کبھی اپنے اعضاء میں ہیجان اور دل میں گرمی محسوس کرتا ہو۔ اسے بھی کبھی اپنا گھر یاد آتا ہو اور اس کے ساتھ کچھ اور ــــ! لیکن یہ فلسفہ سنجی حماقت ہو۔ ایسا ہی وقت خالی ہو تو اس سے زیادہ سنجیدہ مسائل پر کیوں نہ

غور و فکر کیجیے۔ حضرت امام حسینؑ کو شیعوں نے قتل کیا یا سنیوں نے؟ پاکستان میں جنم اشٹمی کا جلوس اٹھے گا یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ!

قلی نمبر ۲۲۶ نے عبداللہ کی پیٹھ پر ایک دوہتڑ مارا۔ "ابے نیند کے بچے پنجاب میل آرہا ہے۔ تیرا باپ" آنکھیں ملتا ہوا عبداللہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اور قلی نمبر ۲۲۶ کی ماں بہنوں کو یاد کرتا ہوا پلیٹ فارم نمبر ۱ کی طرف بھاگا۔ دن بھر پنجاب میل، دہرہ ایکسپریس، سکسٹین ڈاؤن (16 DOWN) فورٹین اپ (14 UP) ہاوڑہ طوفان، الہ آباد پسنجر، ٹن اپ (10 UP) ٹونٹی ڈاؤن (20 DOWN) سکس اپ (6 UP) ٹو ڈاؤن (2 DOWN) اور نہ معلوم کیا کیا الم غلم گاڑیاں جاتی اور آتی رہیں۔ اور قلی نمبر ۲۹۹ ادھر سے ادھر بھاگتا، چیختا، لڑتا جھگڑتا پھرا۔ لیکن وہ کچھ بھولا بھولا سا رہا —— اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس کے پاس سے کچھ کھو گیا۔ اور اس میں کچھ کمی سی ہو گئی۔ لیکن کیا؟ یہ شاید اُسے بھی معلوم نہ تھا۔

شام کو شاہجہاں پور لوکل آئی۔ اسی وقت گورکھپور سے بھی گاڑی آگئی۔ اور بہت سے مسافر ایک گاڑی سے دوسری گاڑی میں جانے لگے۔ ایک تنومند مسافر صاحب نے دو تین ٹرنک۔ ایک بستر۔ اور ایک ناشتہ دان عبداللہ پر لدوایا۔ اور چھوٹی لائن کے پلیٹ فارم سے بڑی لائن کے پلیٹ فارم نمبر پانچ پر چار برقع پوش عورتوں کے ہمراہی میں پہونچے۔ عورتیں زنانہ ڈبہ میں بیٹھ گئیں اور مسافر صاحب بڑے کروفر سے انٹر کلاس میں دھنس گئے۔ درجہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے جگہ ملی عبداللہ کو

اسباب رکھنے میں جان توڑ کوشش کرنا پڑی۔ اور اسے امید تھی کہ کم از کم چار آنہ ضرور ملے گا لیکن تنومند مسافر نے اس کی طرف اکنی والی پھینک دی۔ عبداللہ خوشامد اور فریاد کرنے لگا۔ لیکن اس کے جواب میں تنومند مسافر ڈانٹ اور پھٹکار پر اتر آیا۔ "ابے سور کے بچے یہ دونی کم ہے؟ اور کیا لے گا؟ اپنے باپ کا سر! یہ حرام زادے کبھی سیدھی بات مانتے ہی نہیں۔ پوری مزدوری بھی دے دو تب بھی ہنگامہ کرتے ہیں۔ ان کا علاج بس یہی ہے کہ اتار کر بجاس لگائے" تنومند مسافر کی کرخت آواز اور چہرہ کے اتار چڑھاؤ سے عبداللہ کو کوئی یاد آ گیا ـــــ اس کے دماغ میں چیونٹے سے رینگنے لگے ـــ ارے یہ تو اس کے گاؤں کے ضلعدار صاحب تھے۔ بچھڑے ہوئے وطن کا حاکم! عبداللہ کا چہرہ مارے خوشی کے تمتما اٹھا۔ اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ضلعدار صاحب؟ آپ نے مجھے پہچانا؟"

"تم کون ہو؟" ضلعدار صاحب نے ناک بھویں چڑھائیں۔

"عبداللہ"

"میں نہیں جانتا" ضلعدار صاحب نے نفرت سے کہا۔

"سمیع اللہ کا بھائی۔ نعمت اللہ کا لڑکا۔ امجد کے پڑوس میں رہتا تھا۔"

"تو میں کیا کروں؟ الو کے پٹھے۔ دماغ چاٹ لیا تو نے۔ بڑا آیا وہاں سے اپنا شجرہ سنانے۔ چل دور ہو"

انجن نے سیٹی دی۔ ایک مسافر نے کہنی ماری۔ اور ضلعدار صاحب نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ بڑی مجبوری سے عبداللہ گاڑی سے اتر آیا۔ لیکن کھڑکی کے پاس سے نہ ہٹ سکا۔ ضلعدار صاحب سے دریافت کرنے کے لیے ہزاروں سوالات اس کے

دماغ میں گونج رہے تھے۔ لیکن اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ زبان ہلائے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی رینگنے لگی۔ بے اختیار ہو کر عبداللہ چیخ پڑا۔ "ضلعدار صاحب۔ میرا کھاں ہے؟" بڑے غصّہ سے ضلعدار صاحب للکارے "بے ایمان، پاجی، بدتمیز، نامعقول، کان پکا دیئے تو نے"۔ گاڑی تیز ہو گئی۔ لیکن زنانہ ڈبے میں سے کسی نے بڑی تیزی سے سر نکالا۔ روشنی مدھم تھی۔ اور گاڑی تیز ہو چکی تھی۔ عبداللہ کچھ دیکھ نہ سکا۔ سرخ روشنی چمکتی اور جھلملاتی ہوئی اُفق پر بے تھاہ سیاہی میں غرق ہو گئی۔

"کیا وہ بندا تھی؟" عبداللہ رہ رہ کر یہ سوال اپنے آپ سے پوچھتا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب پا سکے۔ پنجاب میل۔ دیرہ اکسپرس، سکینڈ ڈاؤن۔ فورٹین اپ۔ ہاوڑہ طوفان۔ الہ آباد پسینجر۔ ٹن اپ۔ ٹو ڈاؤن۔ اور نہ معلوم کیا کیا الم غلم گاڑیاں آجاتی ہیں۔ اور عبداللہ کا جیتا جاگتا وجود صرف قلی نمبر ۳۹۹ رہ جاتا ہے جس کے نہ دل ہے نہ دماغ۔ نہ ماں ہے نہ باپ۔ نہ محبوب!!۔

جہیز

سنتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں بہت سے وحشی قبیلے اپنی لڑکیوں کو مار ڈالتے یا زندہ دفن کر دیتے تھے ــــــ وہ آخر ایسا کیوں کرتے تھے؟

ــــ اس زمانہ میں تو جہیز کی رسم نہ تھی! کیسے احمق تھے وہ لوگ؟ اور کیسے خونخوار اور ظالم تھے وہ باپ جو کہ ایسا کرتے؟ لیکن خیر اب زمانہ بدل گیا ہے اور لوگ زیادہ عقل مند ہو گئے ہیں۔ کیسے کچھ: اور اب پرانے قسم کے خونخوار اور ظالم باپ نہیں رہے۔ شاید!

ایک روز میں دفتر سے آکر پلنگ پر لیٹا بیڑی پی رہا تھا کہ دفعتاً میری لڑکی موہنی دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے کہنے لگی "بابا! ایک کتاب میں لکھا ہے کہ پرانے زمانہ میں لوگ اپنی لڑکیوں کو مار ڈالتے تھے! کیا یہ سچ ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم!" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"کیسے ظالم تھے وہ باپ؟" موہنی نے پھر کہا "کیوں بابا؟ وہ ایسا کیوں کرتے؟"

"اپنی لاج رکھنے کے لئے کرتے ہوں گے۔ لڑکی خاندان بھر کی عزت ہوتی

ہے نا؟" میں نے کہا۔

"تو اپنی لڑکیوں کو مار ڈالتے وقت ان لوگوں کو ذرا بھی دکھ نہ ہوتا"

"دکھ کیوں نہ ہوتا؟ لیکن انھیں اپنی لڑکیوں سے زیادہ اپنی لاج پیاری تھی"

میں ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ مٹی میں ہاتھ سانے۔ دھوئیں سے چہرہ کو لال چقندر بنائے میری بیوی سندری باورچی خانے سے بوکھلائی ہوئی آئی اور چیخنے لگی۔ "ارے کیا ہوا؟ کس نے اپنی لڑکی کو مار ڈالا!"

میں اور موہنی بے اختیار قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ سندری جھینپ سی گئی۔ اور غصہ سے ہم دونوں کو گھورتی ہوئی اپنے کام پر واپس چلی گئی۔

میں کہتا " رمیش کے ہاتھ کی گھڑی کیسی خوبصورت ہے۔ دفتر میں کام کرنے والے ہر شخص کے پاس ایک ایسی ہی گھڑی ہونی چاہیے۔ اور سندر بابو کا وہ گرم کوٹ کتنا عمدہ ہے۔ اس کو دیکھتے ہی جاڑا چلا جاتا ہے۔"

موہنی کہتی " پاپا! اب چپلوں کا زمانہ نہیں رہا۔ اس سے پیر بھدے ہو جاتے ہیں۔ سب لوگ جن کے پاس پیسہ ہے اونچی ایڑی کا جوتا پہنتے ہیں۔ اور آپ نے وہ سیتا کا ہار دیکھا؟ موتیوں والا! چاہے کوئی اور زیور نہ ہو بس ویسا ایک ہار ضرور ہونا چاہیے۔"

سندری بولتی " جارجیٹ کی پرانی ساری تو پھٹ کر چیتھڑا ہو گئی۔ اب تو ایسا بھی نہیں کہ برادری میں منھ دکھا سکوں؟"

ہم تینوں پر ایک مایوس کن خاموشی طاری ہو جاتی اور نہ معلوم کتنی دیر

قائم رہتی ——

پھر میں کہتا۔ "اگلے مہینہ میں موہنی کے لیے ایک اونچی ایڑی کا جوتا ضرور آجائے"!

سندری منہ بناتی۔

موہنی کہتی۔ "نہیں پاپا پہلے آپ کا ایک گرم کوٹ بن جائے! جو کوٹ آپ پہنتے ہیں کیسا میلا ہو۔ میں تو اس میں پیوند لگاتے لگاتے عاجز آگئی ہوں"

سندری پھر منہ بنائی۔ اور خفا ہو کر کہتی "ہاں سب آجائے اور میں جو دو برس سے کہتے کہتے تھک گئی کہ ایک گرت کی ساری آجائے تو وہ ہرگز نہ آنے پائے۔ آخر مجھے بھی برادری میں منھ دکھانا ہو یا نہیں؟"

تھوڑی دیر کے لئے پھر خاموشی طاری ہو جاتی۔ لیکن پھر سندری کا غصہ دیکھکر مجھے اور موہنی کو بے اختیار ہنسی آجاتی اور ہم لوگ قہقہہ مار کر ہنسنے لگتے —— ہم لوگ پہلے ہنستے اور سندری بعد میں! اور اسی کی ہنسی اصل ہنسی رہتی۔

مہینہ کی پندرہ تاریخ سے لے کر تیس یا اکتیس تاریخ تک ہم تینوں باپ بیٹی اور ماں اپنے اپنے خوشنما خواب بنایا کرتے۔ اور ان ہی خوابوں میں ایک دوسرے کے لئے ایثار بھی کرتے اور ایک دوسرے سے خفا بھی ہوتے۔ لیکن پھر —— گھڑی۔ گرم کوٹ اونچی ایڑی کا جوتا۔ موتیوں کا ہار۔ ساری۔ یہ سب پرچھائیاں اور اسی قسم کی دوسری پرچھائیاں مہینہ کی پہلی تاریخ کو جب میں دفتر سے اپنی تنخواہ لاکر سندری کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوا میں تحلیل ہو جاتیں۔ میں اور موہنی ایک دوسرے کا منھ تکتے۔ اور سندری کی فیصلہ کن آواز ہوا میں گونجتی سنائی دیتی۔ "ہائے رام! گیہوں روپیہ کے چار سیر۔ ماش روپیہ کے دو سیر۔ اور روئی روپیہ کی ایک سیر! باپ رے باپ! میں کہتی

ہوں آخر یہ کیسے گھر کا دھندا پار لگے گا۔ پاگل ہوئی جا رہی ہوں پاگل!"

میرا خاندان نہایت مختصر تھا۔ میں، میری بیوی اور میری لڑکی موہنی ––– جو واقعی موہنی تھی۔ میں قصبہ کے چھوٹے سے ڈاک خانے میں پوسٹ ماسٹر تھا –– بیس سال سے ––– اور مجھے سینتالیس روپیہ پندرہ آنہ تنخواہ ملتی۔ ایک آنہ تنخواہ کی رسید کے ٹکٹ میں کٹ جاتا۔ مہینہ کی پہلی تاریخ کو اپنی تنخواہ لاکر سندری کے سپرد کر دیتا اور وہ دوسرے دن مجھے بیڑی کے تیس بنڈل یکمشت منگا دیتی۔ پھر مجھے نہیں معلوم ہوتا کہ میری تنخواہ کیا ہوتی اور گھر کا خرچ کیسے چلتا۔ البتہ کچھ نہ کچھ تنگی ہمیشہ رہتی۔ میری بیوی ہمیشہ مجھ سے یہی شکایت کیا کرتی کہ آخر میری تنخواہ کیوں نہیں بڑھتی؟ جب سے گرانی آگئی تھی اس وقت سے ہم لوگوں کی حالت اور بھی خراب ہو گئی تھی۔ اور اب یہ دستور ہو گیا تھا کہ ہر چوتھے پانچویں روز کوئی نہ کوئی قرضخواہ ہمارے دروازے پر کھڑا رہتا۔

ایک چھوٹے سے مقام پر پوسٹ ماسٹر کی حیثیت بھی مضحکہ خیز ہوتی ہے۔ سمجھا تو یہ جاتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کا ایک بڑا عہدہ دار ہے۔ اور حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کی تنخواہ اس کی زندگی کی اولین ضروریات کے لیے بھی کافی نہ ہو سکتی۔ لوگ مجھ سے توقع تو یہ رکھتے کہ میں بہت صاف اور اچھے کپڑے پہن کر چمکدار جوتوں اور خوبصورت سی گھڑی کی معیت میں بڑی شان و شوکت سے ڈاک خانے آؤں لیکن میری کیفیت یہ تھی کہ میں پھٹے کوٹ ٹوٹے جوتے اور میلی ٹوپیاں استعمال کرتا۔ اور ڈیڑھ میل پیدل چل کر ہانپتا ہوا دفتر میں داخل ہوتا۔ چھٹے چھ ماہے قصبہ کے لوگ مجھے دعوتوں میں بھی بلا لیتے۔ لیکن ایسے

موقعوں پر میری موجودگی صرف ایک مرقع عبرت ثابت ہوتی۔

تب بھی لوگ مجھ پر رحم نہ کھاتے! — میرے سننے میں آتا کہ لوگ مجھے کنجوس کہتے ہیں۔ منحوس سمجھتے ہیں۔ کمینہ قرار دیتے ہیں۔ اور ذلیل تصور کرتے ہیں۔ میرے دور کے رشتہ دار طرح طرح کے قصے کہانیاں میرے خلاف مشہور کرتے۔ لوگوں کو ورغلاتے کہ وہ سویرے اٹھ کر میرا منہ نہ دیکھیں۔ غرضیکہ ہر جگہ میرا مذاق اڑتا اور مجھے مطعون اور بدنام کیا جاتا۔ لوگوں کو مجھ سے عام شکایت یہ تھی کہ وہ اپنے اندازہ کے مطابق سمجھتے کہ مجھے کوئی بڑی لمبی چوڑی تنخواہ ملتی ہے اور میں اس سے دوگنی رشوت لیتا ہوں۔ اور یہ سب رقم میں جوڑ رہا ہوں اور سود پر چلاتا ہوں۔ اور نہ کچھ کھاتا ہوں نہ پیتا ہوں، نہ لوگوں کی دعوتیں کرتا ہوں اور نہ ان کو قرض دیتا ہوں اور نہایت "پھیچڑ" حالت بنائے گھومتا رہتا ہوں اور دل ہی دل میں دوسرے لوگوں کی مفلسی یا فضول خرچی پر خوش ہوتا ہوں جب لوگ مجھے میرے بوسیدہ پیوند لگے ہوئے کوٹ اور منہ پھاڑے ہوئے جوتوں اور تیل سی چکٹی ہوئی ٹوپی میں دیکھتے تو طعنہ دیتے۔ "کیوں یار! کس کے لئے جوڑ رہے ہو یہ سب دولت؟" "دوسروں کو نہ دو خود تو کھا پی لو"

اپنے گرد و پیش ناحق خدا واسطے کی یہ سازش دیکھ کر میرا دل جل بھن کر کباب ہو جاتا اور جوش انتقام سے میرا جی یہ چاہتا کہ میں اپنے خلاف ہر فضول بکنے والے کو پھانسی دے دوں۔ لیکن کیا کرتا! — مجبور تھا۔ اندر ہی اندر طوفان اٹھتے۔ زلزلے آتے لیکن — غصہ میں دو چار بیڑیاں اور زیادہ پی جاتا اور بس! — اتنا بھی نہ ہوتا کہ کبھی تنخواہ سے اس قدر پس انداز ہو جاتا کہ میں ایک نیا گرم کوٹ بنوا لیتا۔ یا ایک چمکدار جوتا خرید لیتا۔ گھڑی کا تو ذکر ہی کیا! گھڑی کی تمنا تو اس وقت سے

میرے دل میں کھٹک رہی تھی۔ جب کہ میں صرف دس برس کا تھا۔

میری لڑکی موہنی پچیس برس کی ہو چکی تھی۔ ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، شادی کی بات چیت کئی جگہ سے ہوئی لیکن پھر نہیں معلوم کیا ہوتا کہ وہ لگ لگ کر چھوٹ جاتی۔ مجھے اس بات کی بڑی فکر اور پریشانی تھی۔ اور واقعی یہ بات تھی ایسی ہی تھی۔ لیکن اس فکر اور پریشانی نے سندری کو تو بالکل ہی پاگل اور بدحواس کر دیا تھا۔ جس روز سے موہنی نے پندرہویں سال میں قدم رکھا تھا۔ اس کی ماں اس کی شادی کے لئے بے چین ہو گئی تھی اور جیسے جیسے دن گذرتے گئے اور موہنی بڑھتی گئی اس کی ماں کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا۔ دو چار جگہ کے پیغاموں کی ناکامی تو اسے انگاروں پر لٹا دیا اور وہ دن رات موہنی کی شادی کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ جب اس کا اور کوئی بس نہ چلتا تو وہ مجھے پکڑ پکڑ کر جھنجھوڑتی "اندھے ہو، دیوانے ہو، احمق ہو۔ دیکھتے نہیں جوان لڑکی گھر میں بیٹھی ہے اور تمھیں شادی کی کوئی فکر نہیں۔ آخر کیسے ہوتی ہے دنیا میں شادی! کون سی فی ہماری لڑکی میں ہے۔ صورت کی، شکل کی، گُن کی، ڈھنگ کی، پھر آخر کیوں نہیں ہوتی اس کی شادی محض تمھاری وجہ سے۔ تم تو دن رات بیٹھے بیڑی پیا کرتے ہو۔ ڈاک خانے سے چرائی ہوئی کتابیں پڑھا کرتے ہو۔ تمھیں تو عشق و محبت کے جھوٹے سچے قصوں ہی سے نہیں فرصت! ایسے ہوتی ہے کہیں شادی! نہ کسی سے ملنا نہ جلنا۔ ہر وقت دم دبائے گھر میں گھسے رہتے ہو۔ کیا آسمان سے کودے گا کوئی داماد! سنتے نہیں محلہ والے کیا کہتے ہیں؟ سارا قصبہ تم پر تھوک رہا ہے! میں نے اسی وجہ سے تو کہیں نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ آخر کیا سوچ رہے ہو تم۔ بولتے کیوں نہیں میں بھی

تو سنوں کیا ٹھان رکھی ہو تم نے ؟ نرے احمق !" اور جب اور زیادہ بوکھلا جاتی تو کہتی "مجھ سے تو اب یہ بے خیرتی نہیں دیکھی جاتی ۔ دیکھ لینا کسی دن کچھ کھا کر سو رہوں گی "

مجھے سندری پر بڑا رحم آتا ۔ میں سب کچھ دیکھتا اور سنتا لیکن آخر کیا کرتا ۔ کہاں جاتا اور کس سے کہتا ؟ سب سے بڑی بات جہیز کی تھی ۔ بھولا بھٹکا اگر کوئی شادی کی بات چیت کرنے والا آ بھی جاتا تو وہ جہیز اس قدر مانگتا جو میں کیا میری سات پشتیں بھی نہ ادا کر سکتیں ۔ مجھ پر تو ایک مایوسی کا سا عالم طاری ہو گیا تھا ۔ لیکن میں اس کو سندری سے چھپائے رکھتا ورنہ وہ اپنی جان ہی دے دیتی ۔

ایک روز مجھے اپنے دفتر کے کسی کلرک سے معلوم ہوا کہ قصبہ میں ایک بھاشکر بابو رہتے ہیں جو یوں تو دلالی کا ہر ایک قسم کا کام بڑی خوبی اور سلیقہ سے کرتے ہیں ۔ لیکن شادی بیاہ کرا دینے میں انھیں خاص ملکہ اور مہارت حاصل ہے ۔ ان کی لگائی ہوئی بات کبھی مدھم نہیں پڑتی ۔ اور اپنی حکمت عملی سے انھوں نے بعض ایسی ناکامیاب ہستیوں کے ایسے کامیاب جوڑے لگوا دیئے ہیں کہ وہ دور دور تک مشہور ہو گئے ہیں اور آس پاس کے شہروں تک کے آدمی ان کے پاس اپنی مشکل کشائی کرانے آتے ہیں ۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے ایک ایسے معرکہ کی شادی کرائی کہ قصبے کے سارے لوگ ان کی ہوشیاری اور رسائی پر ششدر کرتے رہ گئے ۔ قصبہ کے ایک تعلقدار نے ایک رئیس کی لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا ۔ اور ایک معمولی تاجر کی لڑکی سے شادی کر لی تھی ۔ رئیس جذبۂ انتقام میں جل بھن کر کباب ہو گیا ۔ اور اس نے بدلہ لینے کی کوئی ترکیب نکالنے کے لئے بھاشکر بابو کا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ بھاشکر بابو نے اسے تسلی تشفی دی اور اس کی حمایت میں کمر ہمت باندھ کر تیار ہو گئے ۔ تین ہی مہینہ میں انھوں نے کوئی ایسا منتر پھونکا کہ

تعلقدار صاحب نے تاجر کی لڑکی کو تو طلاق دے دی اور اسکے خوشامد کرتے اور گڑگڑاکر رئیس کی لڑکی کو بیاہ لے گئے۔

میں نے بھاشکر بابو کے یہ کرامات اور فضائل سُنے تو میرے منھ میں پانی بھر آیا۔ پہلے تو میری ہمت پڑی نہیں کہ اپنے ایسے ہیچداں وجود کو ایسی مقتدر اور عقل کل ہستی کے حضور میں لے جاؤں۔ لیکن پھر مجھے جانا ہی پڑا۔ بھاشکر بابو ملے اور بہت اچھی طرح ملے۔ انھوں نے بڑے اخلاق اور ہمدردی سے میری پوری کہانی سُنی اور پھر نہایت محبّت سے فرمانے لگے " بس اتنی سی بات! تم نے مجھ سے پیشتر کیوں نہیں کہا؟ منٹوں میں بنائے دیتا ہوں منٹوں میں۔" اظہار احسان مندی میں میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے " بھاشکر بابو میں آپ کے رحم وکرم پر ہوں۔ آپ کے سوا میرا کوئی نہیں۔ میری لاج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔" بھاشکر بابو نے میری ڈھارس بندھائی اور میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا " بابو جی ہمت چاہیئے ہمت۔ بس پھر تو بیڑا پار ہے۔ مجھ سے آپ کی جو کچھ سیوا ہو سکے گی میں اُٹھا نہ رکھوں گا۔ آپ کی لڑکی میری لڑکی ہے۔"

بھاشکر بابو موٹے بھدّے اور پستہ قد انسان تھے۔ ان کی توند ذرا ضرورت سے زیادہ آگے بڑھی ہوئی تھی۔ ان کا سر بڑا اور ماتھا چوڑا تھا لیکن آنکھیں بہت چھوٹی تھیں اور بہت تیزی سے جلدی جلدی حرکت کرتیں۔ مجھے یہ سب ہوشیاری اور عقلمندی کے قرائن معلوم ہوئے۔ ان کی طوطے نما بھدّی سی ٹیڑھی ناک اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتی۔ میں نے پہلے ہی سے سُن رکھا تھا کہ بڑی ناک والے بڑی ہوشیاری اور ہمت والے انسان ہوتے ہیں۔ اور ان سب باتوں کے علاوہ میں سب سے زیادہ بھاشکر بابو کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہوا۔ ان سے ملنے کے بعد مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے مجھے میرا

نجات دہندہ مل گیا اور میری ذمہ داری کا بوجھ دفعتاً میرے کاندھوں پر سے اٹھ گیا۔

میں خوشی خوشی گھر پہونچا اور بھا شکر بابو سے اپنی ملاقات اور اُن کے جذبہ گذشتہ کارناموں کا کچا چٹھا بہت کچھ نمک مرچ لگاکر سندری کو سنایا۔ وہ مارے خوشی کے پھولے نہ سمائی۔ بار بار کہنے لگی " میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ آدمی کوشش کرے تو کیا نہیں کر سکتا۔ ؟ کوشش سے بھگوان تک تو مل ہی جاتا ہے۔ میں اگر مرد ہوتی تو ایک کیا سات لڑکیوں کی شادی کر چکی ہوتی ۔" اس نے یہ تمام باتیں نہایت نیک نیتی سے کہیں۔ اور اس کا مطلب مجھے کوئی طعنہ دینا ہرگز نہ تھا بلکہ اس وقت تو اس نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ ——— ان نظروں سے پچیس برس بیشتر ہی دیکھا ہو تو دیکھا ہو

اس روز سندری بڑی رات تک جاگتی رہی اور نہ معلوم کیا کچھ بکتی رہی۔ میں اسے اس سے بیشتر اتنا باتونی کبھی بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے شیخ چلی کی طرح ہوائی قلعے بنانا شروع کئے تو ان کو آسمان تک اٹھاتی ہی چلی گئی۔ حتیٰ کہ اپنے آئندہ ہونے والے نواسوں کے مونڈنوں تک کی تفصیلات طے کر دیں۔ اور اگر میں سو نہ جاتا تو وہ نہ معلوم کیا کچھ کر ڈالتی۔

دوسرے روز میں ابھی اچھی طرح سو کر بھی نہیں اٹھا تھا کہ سندری نے مجھے کریدنا شروع کیا۔ " جاؤ بھا شکر بابو سے مل آؤ۔ غرض اپنی ہو کوئی ان کی تھوڑی ہے۔ تم یاد نہیں دلاتے رہوگے تو وہ بھول جائیں گے۔" شام کو میں دفتر سے واپس آیا تو ایک کشتی میں چنے کا حلوہ جس پر بڑی دریا دلی سے میوہ بھرا ہوا تھا ایک تولیہ میں لپٹا رکھا تھا۔ میں نے ابھی گھر میں قدم ہی رکھا تھا کہ سندری کہنے لگی " ذرا یہ حلوہ بھا شکر بابو کے یہاں تک پہونچوا دو۔" مجبوراً مجھے جانا ہی پڑا۔

سندری کا دستور سا ہو گیا تھا کہ ہر تیسرے چوتھے روز کوئی حلوہ یا مٹھائی بناتی اور

بھاشنکر بابو کے یہاں بھیجتی. بھاشنکر بابو بھی ریشہ خطمی ہوئے ہوئے تھے۔ میں جب ملتا تو وہ فوراً محبت سے لپٹ جاتے اور میرا دل خوب بڑھاتے ان کی باتوں میں کچھ عجیب جادو سا ہوتا اور میں ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ باور کر لیتا۔ رفتہ رفتہ وہ خود ہمارے یہاں آنے لگے۔ تیسرے چوتھے روز ضرور آتے اور سندری کا پکایا ہوا پکوان خود اپنی صرفت لے جاتے۔ جب وہ آتے تو سندری دروازہ کی آڑ میں لگ کر کھڑی ہو جاتی اور جب تک وہ بیٹھے رہتے وہ کھڑی ان کی باتیں سنا کرتی۔ بھاشنکر بابو ہر دفعہ اپنے ساتھ کوئی شادی کا پیغام ضرور لاتے لیکن پھر خود ہی اس کو یہ کہہ کر رد کر دیتے۔ "جگہ تو اچھی ہے۔ لڑکا بھی ہونہار ہے لیکن میری طبیعت کچھ جمتی نہیں۔ موہنی کے لئے تو کوئی سچ مچ کا موہن چاہیئے۔ اور پھر موہنی کے لئے کہیں بر کی کمی ہے۔ چھانٹ کر کروں گا بابو جی چھانٹ کر! جب تم بھی تماشہ ہی دیکھتے رہ جاؤ۔ ایسی اچھی لڑکی جو ایسے مزیدار پکوان پکاتی ہو۔ روز روز نہیں ملتی!"

بھاشنکر بابو کی باتوں میں مجھ کو اور سندری کو کچھ ایسا مزا آتا کہ ان کے چلے جانے کے گھنٹوں بعد تک ہم دونوں آپس میں وہی باتیں دہرایا کرتے۔ ہمیں ان پر پورا پورا اعتماد تھا اور ہم یہ سمجھتے تھے کہ اب موہنی کی شادی ہوئی رکھی ہے اور زیادہ فکر کی ضرورت نہیں۔ ناامیدی میں اُمید جھلکنے لگی اور مایوسیوں کی جگہ آرزوؤں اور تمناؤں نے لے لی۔ سچ پوچھئے تو ہماری زندگی کی تاریک رات میں بھاشنکر بابو نور سحر بن کر جھلملانے لگے!

اپنی پیاری موہنی کو بھی میں خوش دیکھتا۔ جب اس کی شادی کی باتیں ہوتیں تو شرم کے مارے دوشیزگی کی سرخی اس کے رخساروں پر دوڑ جاتی اور وہ دبک کر

ایک کونے میں بیٹھ جاتی۔ اور اکثر اپنی آنکھیں بھی بند کرلیتی۔ لیکن —— میں جانتا کہ وہ بھی خوش ہے! کبھی کبھی وہ کنکھیوں سے مجھے مسکرا کر دیکھتی اور میں دفورِ محبت سے اسے اپنے سینہ سے لگا لیتا۔ اس کے دلہن بننے کی تصویریں ہر وقت میری آنکھوں میں ناچا کرتیں۔ سندری نے بھی اس کے لاڈ و پیار میں اضافہ کر دیا تھا۔ اب وہ اس پر کبھی بھی کسی بات پر ناراض نہیں ہوتی۔ اگر موہنی کوئی کام بگاڑ بھی دیتی تو وہ صرف یہی کہہ کر چپ ہو جاتی۔ "موہنی اب تو تو دوسرے گھر جا رہی ہے۔ کب تک کرے گی یہ بے ڈھنگی باتیں۔؟" اکثر اوقات موہنی کو چڑانے کے لیے میں کہتا۔ "اب تو خوب پہنے گی اونچی ایڑی کے جوتے اور چمکیلے چمکیلے ہار" موہنی کا چہرہ غضب سے تلملا جاتا اور وہ "نا بابا! ایسی باتیں نہ کیجیے" کہتی ہوئی اپنا رخ دوسری طرف کر لیتی۔

ایک روز بھاسکر بابو آئے تو اپنی ناک مروڑتے ہوئے اور ہنستے ہوئے کہنے لگے "لو مبارک! بات پکی ہو گئی۔ آخر ڈھونڈھ ہی نکالا نہ میں نے؟"

میں نے کہا "آخر کیا؟ کچھ میں بھی سنوں"

کہنے لگے "بات سنیئے گا بعد میں۔ پہلے سیدھے ہاتھ سے مٹھائی منگائیے۔"

میں نے پوچھا "کچھ بتائیے تو سہی!"

فرمایا۔ "ایسا تیر نشانہ پر بیٹھا ہے کہ بس میں کیا کہوں؟ میری خود لڑکی ہوتی تو میں اس سے بہتر جگہ نہ ڈھونڈھ سکتا۔ موہنی کے تو بھاگ کھل گئے۔ بڑی بھاگوان لڑکی ہو۔"

"...........فرمائیے نا!"

"ارے پنڈت اودھ بہاری مہاجن کو تو تم جانتے ہی ہو گے۔ مہاجن کیا ہیں ساہوکار ہیں ساہوکار! لاکھوں کا لین دین کرتے ہیں۔ ان ہی کے سالے کے ساتھ۔ پنڈت منی رام ہے نام ان کا۔ بیس سال سے قصبہ کی تحصیل میں وکالت کرتے ہیں۔ گھر ہے۔ جائداد ہے۔ آدمی تمیز دار ہیں۔ باسلیقہ ہیں۔ باعزت ہیں۔ گھرانا مشہور ہے اور پرانا۔ ماں باپ کوئی نہیں ہیں' لڑکا خود مختار ہے اور کیا چاہیئے؟ اور پھر چار پانچ سو روپیہ مہینہ کی وکالت! ہزاروں میں ایک ہیں ہزاروں میں۔!"

"اور عمر کیا ہے ان کی؟ میں نے دبی زبان سے پوچھا۔

"یہی بس تمہارے لگ بھگ۔"

"میری عمر تو تقریباً ۴۵ سال کی ہو گی۔"

"تو ان کی عمر زیادہ سے زیادہ چھیالیس کی ہو گی۔ ابھی جوان آدمی ہیں بالکل جوان! پارسال تک تو ان کے لڑکے ہوتے ہیں۔"

"کیا لڑکے بھی ہیں ان کے"؟

قہقہہ مار کر بھاشکر بابو بولے "ارے یہی تو مزا ہے۔ موہنی کی دلچسپی کا سامان وہاں پہلے ہی سے موجود ہے۔ ایک لڑکا ہے کوئی پندرہ برس کا اور دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہیں۔ ابھی چار ہی مہینے تو ہوئے ان کی بیوی کو مرے ہوئے۔"

میں تھوڑی دیر کے لیے شش و پنج میں پڑ گیا۔ میرے دماغ میں کچھ اس قسم کے بے ربط خیالات آنے لگے —— چھیالیس سال کی عمر —— تحصیل کی وکالت —— ایک لڑکا دو لڑکیاں —— گرم کوٹ —— ہاتھ کی گھڑی —— اونچی ایڑی کا جوتا —— موتیوں کا ہار!

اندر کے دروازہ کی آڑ سے سندری کی آواز سنائی پڑی۔ "اب سوچ بچار کس بات کا؟ بھگوان پر بھروسہ کرکے جو کچھ کہنا ہو کہہ دو۔ ہم تو اپنی لڑکی بھاشنکر بابو کے سپرد کر چکے۔ جیسا ان کے من میں آئے ویسا بر ڈھونڈھ کر کریں۔ اب اچھے اور برے کے وہی مالک ہیں۔"

میں نے کہا "بھاشنکر بابو لڑکی آپ کی ہو۔ آپ سوچ سمجھ لیں۔"

بھاشنکر بابو نے نہایت سنجیدہ ہو کر بڑی ذمہ داری سے کہا۔ "پوسٹ ماسٹر صاحب آپ کچھ خوف نہ کریں۔ میں نے صرف لڑکے کو نہیں بلکہ اس کی سات پشتوں تک کو خوب ٹھونک بجا لیا ہو۔ ذات پات میں چوکس۔ گھر گرہستی میں بڑھیا اور اس کے گھرانے کی عزت اور شان تو پوچھنا ہی بے کار۔ اب اور کیا رہ گیا۔ آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔ اگر آپ کی لڑکی دودھوں نہ نہائے اور پوتوں نہ پھلے تو میرا ذمہ، جو چور کی سزا وہ میری۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ——— ذرا کان لائیے گا ادھر۔"

میں نے گھبرا کر پوچھا "اور وہ کیا؟"

فرمانے لگے بس صرف تین ہزار! دو ہزار نقد۔ اور ایک ہزار کی ٹیم ٹام یعنی اوپر کا صرفہ۔"

"تین ہزار" میں نے چیخ کر کہا۔ سارا کمرہ اور اس کے اندر گرم کوٹ ——— ہاتھ کی گھڑی ——— اونچی ایڑی کا جوتہ ——— موتیوں کا ہار۔ مجھے رقص کرتا نظر آنے لگا۔

نہایت معصومیت سے کہنے لگے۔ "تو بھائی اس سے کم میں کیا ہو سکتا ہو؟ شادی کیا یہ تو ایک موڈن کا بھی خرچ نہیں۔ اور پھر موہنی کے علاوہ بھارا اور

کون بیٹھا ہو۔"

میرے منھ سے بہ مشکل آواز نکل سکی "لیکن اننا روپیہ تو ہو" دروازہ کی آڑ سے بھی کچھ پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ بڑبڑانے لگا۔

بھاشنکر ! برخلاف توقع مسکرائے "ہمت کیجیے بابو جی ہمت ! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ کی ایسی حیثیت کے آدمی کے لیے تین ہزار کیا تیس ہزار بھی مشکل نہیں۔ میں نے دودھا والوں سے چھ مہینے کی مہلت لی ہو۔ آپ سب انتظام مجھ پر چھوڑ دیں۔ دیکھ لیجیے گا اگر بھگوان کی مرضی ہوئی تو سب کام چٹکیوں میں بن جائے گا۔"

میں نے دردناک لہجہ میں کہا "بھاشنکر بابو ! بھگوان کا واسطہ مجھ پر دیا کرو تم میری حالت دیکھتے نہیں گت کے کپڑے تک تو نصیب نہیں۔ برسوں سے ارمان ہو کہ ایک گرم کوٹ بنواؤں، ایک جیبی گھڑی خریدوں، اور قاعدہ کی ٹوپی اور جوتا پہنوں لیکن نہیں جڑتا آخر کہاں سے لاؤں میں تین ہزار! تین سو پر تو میرا دم نکلتا ہو۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا بھگوان کی کرپا سے تو میں پیغام دیئے دیتا ہوں پنڈت دھنی رام کو! تم سب خاطر جمع رکھو" یہ کہتے ہوئے بھاشنکر بابو نے اپنی توند سنبھالی اور چلتے بنے ——— ٹھیک ہو گئی موہنی کی نسبت ! تین چار روز میں ابتدائی رسمیں بھی ہونے لگیں۔

"چاہے کچھ بھی ہو۔ موہنی کی شادی ضرور ہو جائے۔" سندری نے تحکمانہ لہجہ سے کہا اور کانپتی ہوئی گئی، اور کوٹھری سے مٹی کی ایک ہانڈی اٹھا لائی اور اس کو میرے سامنے الٹ دیا۔ کھن کھن کھن کھن۔ میرے سامنے روپیوں کا ایک چھوٹا سا انبار لگ گیا۔

"لو یہ میں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اسی دن کے لیے جمع کیا تھا۔ اب تم جانو تمھارا کام۔ میں نے عورت ذات ہو کر اتنا کیا ہے۔ اب تم مرد مانس ہو جو تم سے بن سکے تم کرو! آخر لڑکی کو بیاہنا ہی ہے، ساری عمر تو گھر میں بٹھائے نہیں رکھنا۔"

تعجب سے میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ میں نے روپوں کو شمار کیا۔ پورے بارہ سو تھے۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ لیکن باقی اٹھارہ سو کہاں سے آئیں گے؟ سندری کو جاڑا سا آگیا تھا۔ وہ اپنی پھٹی ساری میں بُری طرح کانپ رہی تھی کچھ نہ بول سکی۔

میں بھا شنکر بابو سے جا کر ملا اور انھیں بتایا کہ بارہ سو کا انتظام تو ہو گیا ہے۔ لیکن اب اٹھارہ سو کہاں سے آئے؟ انھوں نے دنیا بھر کی ناممکن العمل ترکیبیں بتا ڈالیں۔ میں نے بڑی خوشامد کی۔ ہاتھ جوڑے۔ پاؤں پڑا کہ کسی صورت سے یہ تین ہزار روپیہ جہیز کی رقم کم ہو جائے۔ لیکن وہ ایک نہ مانے۔ جھلا کر کہنے لگے۔ "معاف کیجیے گا پوسٹ ماسٹر صاحب آپ تو بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ دولھا والوں سے اگر ایک پائی بھی کم کرنے کے لیے کہا گیا تو وہ شادی کرنے سے صاف انکار کر دیں گے۔ وہ تو کسی صورت سے دس ہزار روپیہ سے کم پر راضی نہیں ہوتے۔ میں نے ہزار منت سماجت سے ان کو سمجھایا کہ بھائی تین ہزار اس وقت لے لو اور پھر تو پوسٹ ماسٹر صاحب کی ساری دولت تمھاری ہی ہے۔ موہنی کے علاوہ ان کی کوئی اولاد نہیں۔ نہ معلوم کس وقت سے تو راضی ہوئے ہیں۔ اب آپ اگر تین ہزار کا بھی انتظام نہیں کر سکتے ہیں تو آپ کی خوشی پھر مجھ سے کبھی کچھ نہ کہیے گا؟ ذرا غور تو کیجیے پچیس برس کی آپ کی لڑکی اور اس کے لیے ایسا چھٹا ہوا دولھا اور آپ تین ہزار دینے میں بھی کنّی کاٹتے ہیں۔"

قصہ مختصر بڑی ہائے ہتیا کے بعد بھا شنکر بابو اور سندری نے شادی کا یہ بجٹ

بتایا کہ بارہ سو روپیہ تو سندری دے، ایک ہزار روپیہ کا مکان فروخت کیا جائے چار سو روپیہ میں اپنے محکمہ سے قرض لوں جس کے عیوض ماہ بماہ پندرہ روپیہ میری تنخواہ سے کٹے (اس سے زیادہ میں قرض بھی نہ لے سکتا) اور بقیہ چار سو روپیہ کے لیے میں کوئی دوسرا انتظام کروں، گھر کی گرہستی بیچوں۔ اڈا بڈا نیلام کروں —— چاہے چوری کروں۔ ڈاکہ ڈالوں بجن کروں۔ کچھ بھی کروں! —— میری لڑکی کی شادی ہو رہی تھی یا میں پھانسی کے تختہ پر لٹکایا جا رہا تھا۔؟ لیکن اب فیصلہ ہو چکا تھا اور سوائے گردن جھکا دینے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں تو اس دن کے تصور ہی سے کانپتا جب میری تنخواہ صرف تیس روپیہ پندرہ آنہ رہ جاتی اور موروثی مکان فروخت کر کے مجھے کسی کرایہ کے مکان میں منتقل ہونا پڑتا اور ماہ بماہ اس کا کرایہ ادا کرنا پڑتا اور گھر کے برتن تک بازار میں بک جاتے اور میرے گرم کوٹ اور ہاتھ کی گھڑی کی خواہش ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی۔ سندری یوں تو میری بزدلی اور کم ہمتی پر غصہ کرتی ناک بھوں چڑھاتی۔ لیکن جب مجھے حد سے زیادہ مایوس دیکھتی تو کہتی "بھگوان سب دیکھتا اور سب سنتا ہے وہی مدد کرے گا"۔ لیکن میرے دل میں کوئی چٹکیاں لے لے کر کہتا بھگوان —— اندھا —— بہرا —— ظالم کو فتح مند اور مظلوم کو شکست خوردہ دیکھنے والا —— ذلیل کو ذلیل تر۔ مایوس کو مایوس تر کر دینے والا —— وہ کچھ نہیں دیکھے گا۔ کچھ نہیں سنے گا کچھ نہیں کرے گا!!۔

تین مہینے گزر گئے —— اب شادی کے اور شاید میری زندگی کے

صرف تین مہینے باقی تھے !! سب انتظام نامکمل تھا اور میں پہلے سے کہیں زیادہ بدحواس تھا۔

موہنی کو ڈبل نمونیہ ہو گیا۔ اس کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ بچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ ڈاکٹروں نے قریب قریب جواب دے دیا۔ بالکل مایوسی کی حالت ہو گئی۔ میری اور سندری کی کیفیت ناگفتہ بہ تھی۔ پاگلوں اور دیوانوں کی طرح سندری رات دن موہنی کے پلنگ کے گرد گھومتی اور میں دواخانوں اور شفاخانوں کے چکر کاٹتا۔ خدا خدا کر کے آٹھویں روز موہنی کی طبیعت سنبھلی دوائیں اپنا اثر دکھانے لگیں اور صحت کے آثار نمودار ہوئے۔ ڈاکٹروں نے اطمینان دلا دیا۔ اور میں نے اور سندری نے کہنا شروع کر دیا "بچ گئی ہماری موہنی!" موہنی جہاں پہلے آنکھ نہ کھول سکتی اور بات نہ کر سکتی۔ اب آنکھ بھی کھولنے لگی اور بات بھی کرنے لگی۔

ڈاکٹروں نے موہنی کے لیے دو دوائیں دے رکھی تھیں۔ ایک سینہ پر مالش کی جس کی کہ شیشی پر سرخ جلی حرفوں میں "زہر" لکھا ہوا تھا۔ اور دوسری پینے کی جو دن رات میں ہر تیسرے گھنٹہ پر پلائی جاتی۔ سینہ پر مالش سندری کرتی اور دوا میں پلاتا تھا۔ میں نے ڈاک خانے سے ایک ماہ کی چھٹی لے رکھی تھی اور ہر وقت موہنی کی تیمارداری میں لگا رہتا۔

رات کے آٹھ بجے تھے میں دواخانہ سے مالش کی اور پینے کی دونوں دوائیں بندھا کر لایا۔ موہنی اس وقت غافل تھی اور اس کے پیروں پر سندری جو کئی راتوں کی جاگی ہوئی تھی بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے سندری کو جگایا اور اس سے کہا کہ وہ علیحدہ پلنگ پر جا کر سو رہے۔ میں دن میں سو چکا ہوں رات کو جاگتا رہوں گا۔ اور وقت سے

دوا پلا دوں گا۔ سندری نے پوچھا "اور مالش کون کرے گا؟"۔ میں نے اسے ڈاکٹر صاحب کا کہا بتا دیا کہ رات کو مالش نہ ہوگی اور وہ اطمینان سے جا کر سو رہی۔ میں ایک کرسی گھسیٹ کر موہنی کے سرہانے بیٹھ گیا۔ پہلے تو میں نے ایک رسالہ اٹھالیا اور اس کو پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن پھر میرے خیالات منتشر ہو گئے اور میں نے اس کو بند کر دیا بھاشنکر بابو کے یہاں سے جو میں ایک چھوٹی سی ٹائم پیس مانگ لایا تھا وہ سامنے میز پر رکھی ہوئی ٹک ٹک کر رہی تھی۔

میں نے موہنی کی طرف دیکھا اس کے زرد رخساروں پر صحت کی ہلکی ہلکی مدہم سرخی آرہی تھی۔ میں نے اس دریافت پر خوش ہونے کی کوشش کی۔ لیکن میں خوش نہ ہوسکا۔ مجھے موہنی کی شادی کی لٹکتی ہوئی تلوار اپنے سر سے قریب تر ہوتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے موہنی ازسرنو زندہ ہو رہی ہو اور اس کی زندگی کی بتدریج ترقی کے ساتھ میری زندگی زائل ہو رہی ہو ——— موہنی کی شادی کو اب صرف دو ماہ پندرہ یوم رہ گئے تھے۔ میرے دل پر ایک موگری سی پڑی ———

گھڑی نے نو بجائے اور میں نے ایک خوراک دوا موہنی کو پلا دی۔

موہنی دھیرے دھیرے سے کراہ رہی تھی۔ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے موہنی کے ساتھ ساری انسانیت کراہ رہی ہو ——— کیسی دکھی تھی یہ دنیا!

——— مظلوم کا کوئی نہیں ——— بھگوان بھی نہیں! ———

سماج! کیسا کمینہ تھا سماج! ——— تین ہزار روپیہ جہیز! ———

ارے بھگوان ——— دلال ——— بھاشنکر بابو ———

مہنتی ——— مہاجن ——— آخر کیا تھا یہ سب گورکھ دھندا

—— لڑکی —— شادی —— غلامی —— غلامی کی

قیمت —— جہیز —— غلام خود غلامی کی قیمت ادا کرے!

—— دولھا کو رشوت! —— اپنی لڑکی کی عصمت لے لینے

کا محنتانہ! میں گڑبڑا کر چونک اٹھا۔ شاید میں اونگھ گیا تھا۔ گھنٹے نے بارہ کا گجر بجایا!

اور میں نے موہنی کو دوا کی دوسری خوراک پلادی۔

چند منٹ کے بعد موہنی نے آنکھ کھولی۔ اس کے گلے میں خرخراہٹ ہوئی بیمار جسم کپکپایا اور پھر بے چینی کے یہ سب آثار موہنی کے چہرہ پر ایک ہلکے سے تبسم میں تحلیل ہو گئے۔! اس نے آنکھ بند کرلی۔ گلے کی خرخراہٹ خاموش ہوگئی اور اس کا جسم بالکل ہی بے حس و حرکت ہوگیا۔ یہ سب آنکھ جھپکتے ہی ہوگیا! میں نے لپک کر موہنی کے ماتھے پر ہاتھ رکھا —————— میری بچی! میرا کلیجہ۔ میری روح اس دنیا میں نہ تھی:۔

میری ایک اجڑے ہوئے باپ کی چیخ سن کر دکھیاری ماں سندری دوڑتی ہوئی آئی۔ پھر کیا ہوا؟ —————— میں اپنی بوٹیاں نوچتا سندری اپنا سینہ کوٹتی۔ لاچار اور مظلوم والدین کی آہ و زاری نالہ و شیون ایک طرف تھا اور قدرت کا اٹل سب سے زیادہ اٹل قانون دوسری طرف —————— وہ کسی صورت سے بھی بدل نہ سکتا۔ موہنی مر چکی تھی!

زندگی کی سب سے بڑی مایوسی جب ہوتی ہو جب انسان مرنا چاہے اور نہ مرسکے یا جب وہ دنیا سے بھاگنا چاہے اور بھاگ نہ سکے اور وہ پھر پکڑ کر اس کی

زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ مجھے اور سندری کو اسی قسم کی مایوسی تھی۔ ساری دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ اور ہم لوگ سسک سسک کر اپنی جانیں دے رہے تھے لیکن ——— کمبخت دنیا سے چھٹکارا نہ ملتا تھا۔ کھانا بھی کھانا پڑتا تھا۔ کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ غرضیکہ کسی نہ کسی صورت سے زندہ رہنا پڑتا۔

موہنی کی موت کو ایک ماہ گذر چکا تھا۔ بیٹھے بٹھائے میرے دل میں نہیں معلوم کیا سمائی کہ میں سندری سے کہنے لگا "لاؤ کچھ روپیہ لادو بازار سے کچھ سامان خریدنا ہو۔" سندری جو پیشتر ایک ایک پیسہ کو دانتوں سے پکڑتی۔ موہنی کے بعد روپیوں کو مٹی کے برابر بھی نہ سمجھتی۔ واقعی جب انسان زندگی ہی سے بیزار ہو تو اس کے لیے کسی چیز کی قدر و قیمت ہی کیا؟ اس نے بارہ سو روپیوں والی تھیلی لاکر نہایت بے تعلقی سے میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے دونوں مٹھیوں میں روپے بھر کر اپنی جیب میں ڈال لیے اور اپنا غم بھلانے بازار چلا گیا۔

میں نے ایک سلا سلایا گرم کوٹ خریدا۔ ایک بہت خوش نما گھڑی اپنی کلائی پر بندھائی۔ سندری کے لئے ایک ریشمی ساری لی اور پھر غیر اختیاری طور سے ایک اونچی ایڑی کا جوتا اور ایک نہایت چمک دار موتیوں کا ہار خریدا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس جوتے اور ہار کو میں اپنی موہنی کی یادگار کے طور پر ہمیشہ اپنے پاس رکھوں۔

میری گھڑی خوب چلتی ٹک ٹک ٹک ٹک۔ میں نے اسے اپنے کان سے لگایا۔ کس تیز رفتاری سے چلی جارہی تھی وہ؟ جیسے دریا کی لہریں! آہ! جن لہروں پر میری موہنی دولہن بنی جارہی تھی۔ دور کے آغوش میں۔ بہت دور ——— جہاں جہیز کی رسم نہ تھی۔

گھر پہونچا تو موہنی کا خیال آتے ہی میں بلبلا اٹھا اور اپنے گھر کے دروازہ سے لگ کر بچوں کی طرح سسکیاں بھر کر رونے لگا۔

میں نے بڑی احتیاط سے جوتے اور ہار کو ایک چھوٹے سے بکس میں رکھ کر اپنے کمرہ کی الماری میں رکھ دیا۔ دفعتاً کھلی ہوئی الماری میں میری نظر موہنی کی دواؤں کی شیشیوں پر پڑی ——— میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ سر چکرا گیا اور ایک ہیبت ناک چیخ کے ساتھ میں بیہوش ہو کر تڑاق سے زمین پر گر پڑا ——

پینے والی دوا کی سب خوراکیں پوری تھیں اور مالش کرنے والی دوا کی جس کی شیشی پر سرخ جلی حرفوں سے "زہر" لکھا ہوا تھا دو کم۔!!

خیراتی

(زیر تصنیف ناول گونگی حویلی کا ایک باب)

"خیراتی! کہاں چلا گیا خیراتی"۔ خیراتی کے بڑے بھائی جمعراتی نے زور سے پکارا۔

"ان کا بھی کوئی ٹھکانا ہو، وہ تو بس کھانے کے وقت آئیں گے"۔ جمعراتی کی بیوی بھاتن نے کہا۔

خیراتی نے یہ بھی سنا اور اس کے علاوہ اور جو باتیں ہوئیں وہ بھی سنیں لیکن کچھ نہ بولا اور اپنی جگہ پر خاموش پڑا رہا۔ نیلے آسمان کی سنہری دھوپ میں وہ بیادر کے ایک جھنڈ کی آڑ میں ٹانگیں پھیلائے پڑا تھا اس کے بالکل سامنے ببول کا ایک ٹنڈ منڈ سوکھا درخت کھڑا تھا جس پر ایک بیمار چیل بیٹھی ہوئی تھی۔ درخت کی تین شاخیں تین انگلیوں کی طرح اٹھی ہوئی تھیں اور خیراتی کو یاد دلا رہی تھیں کہ اس کو اپنے وطن جگت پور سے آئے ہوئے تین مہینے گذر گئے۔ سامنے ایک کھیت چھوڑ گھورے کا ایک بہت بڑا ڈھیر تھا اور بھیڑیا ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے جب اس پر سے اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے

آتے تو خیراتی کو سوندھے اور کچھ گرم معلوم ہوتے۔ بائیں ہاتھ کی طرف ایک ادسر سپاٹ تھا جو جہاں تک نظر جاتی چلا گیا تھا۔ خیراتی کو کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ دنیا کے ایک چھور پر آ گیا اور اب اس کے آگے دنیا ختم ہو۔ دائیں ہاتھ کی طرف درختوں کی آڑ میں جگت پور تھا۔ دور کہیں ایک کوا بول رہا تھا۔ اس سناٹے میں اس کی آواز بھی بھلی معلوم ہوتی۔

خیراتی نے بھائی اور بھاوج کی آوازیں اور باتیں بھی سنیں۔ شبراتن کو گھورا ڈالتے بھی دیکھا لیکن وہ بالکل بے حس و حرکت پڑا رہا۔ آج وہ کسی دوسری ہی دھن میں تھا۔ اسے اپنی پچھلی زندگی یاد آ رہی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اپنی پرانی زندگی کا جائزہ لے رہا تھا اور اس گھورے کے ڈھیر کو کھود رہا تھا کہ شاید کوئی ایسی چیز نکل آئے جس کے سہارے وہ اپنی آئندہ زندگی بسر کر سکے۔ لیکن اس کی یہ کوشش بالکل ہی ایسی تھی جیسے کوئی شخص برسوں کے راکھ کے ڈھیر کو اس امید میں ٹٹولے کہ مبادا اس میں سے کوئی دہکتا ہوا انگارہ نکل پڑے۔ خیراتی کے سامنے بھولی بسری یادوں کی پرچھائیاں لیے سنہ خیراتی دوڑتی ہوئی چلی جائیں۔

خیراتی کو اپنے مرے ہوئے باپ ماں پر غصہ آتا کہ انہوں نے اس کا نام خیراتی کیوں رکھا! اس کو اپنی تمام مایوسیوں اور بپتاؤں کی سب سے بڑی وجہ یہی معلوم ہوتی کہ اس کا نام خیراتی تھا۔ جہاں کہیں بھی وہ گیا ہر شخص نے سب سے پہلے اس کا نام ہی سن کر منہ بنا دیا۔ لاہور میں تو وہ ایک گودام سے محض اپنے نام ہی کی وجہ سے نکال دیا گیا۔ بڑے صاحب آئے ہوئے تھے۔ اور گودام کے مزدوروں میں سے ایک مزدور کے ہٹانے کا سوال درپیش تھا۔ بڑے صاحب نے مزدوروں کی فہرست

منگا کر دیکھی اس میں کسی مزدور کا نام تھا جنگ بہادر، کسی کا نام تھا رنجیت سنگھ، کسی کا نام تھا جبن علیخاں۔ کسی کا نام تھا رام کھلاون اور سب سے آخر میں نام تھا خیراتی۔ بڑے صاحب نے لال پنسل اٹھائی اور اس کے نام کے آگے ایک موٹی سی لکیر کھینچ دی اور وہ نوکری سے علیحدہ کر دیا گیا اور محض اپنے نام کی وجہ سے اس کی تقدیر کا دروازہ بند ہو گیا۔

خیراتی اپنی پچھلی زندگی کے کسی کارنامے سے خوش تھا تو اس سے کہ جب وہ مولوی سبحان اللہ کے مکتب میں پڑھانے کے لیے بٹھایا گیا اور اس پر بہت زیادہ لات گھونسے اور ڈنڈے برسنے لگے تو اس نے ایک دن اتفاقیہ مولوی صاحب کی بدھنی توڑ دی تھی، مولوی صاحب نے اسے مارتے مارتے بیدم کر دیا۔ اور اپنے مکتب سے یہ کہہ کر نکال دیا کہ "جا کمبخت تیرا اس مکتب میں کوئی کام نہیں۔ میں آج بیس برس سے اس مکتب میں پڑھا رہا ہوں اور نہ معلوم کتنے گدھوں کو آدمی بنا کر چھوڑ دیا لیکن اب تک تیرا ایسا کوئی کمینہ، پاجی، بدمعاش، حرام زادہ لڑکا نہیں آیا جس نے کہ میری بدھنی توڑ دی ہو"

خیراتی کی گردن میں ہاتھ دے کر مولوی صاحب نے اسے مسجد کے باہر ڈھکیلا تو مسجد کے نیچے کھڑے ہو کر خیراتی نے اپنی زندگی میں پہلا اور شاید آخری اطمینان اور آزادی کا سانس لیا تھا۔ گھر پر باپ نے بہت مارا لیکن اس سے زیادہ نہیں جتنا کہ مکتب میں روزانہ لات، گھونسوں اور ڈنڈوں کے پڑنے کا اوسط تھا۔ مکتب سے آزادی مل گئی اور خیراتی خوش تھا کہ سستی مل گئی۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب وہ اپنا بچپن یاد کرتے ہیں تو انھیں افسوس ہوتا ہے کہ

ہائے کیسے اچھے دن تھے جو گذر گئے اور جو اب پلٹ کر کبھی نہ آئیں گے۔ بے فکری کے ان سہانے دنوں کو یاد کر کے وہ اپنا کلیجہ مسوس مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن خیراتی کے لیے یہ بات بالکل ہی اُلٹی تھی وہ اپنے بچپن کے دن یاد کرتا تو کراہ اٹھتا۔ دو برس تک تو مولوی سبحان اللہ قصائی کے انتہائی ظلم و ستم کا شکار رہا۔ پھر خدا خدا کرکے وہاں سے نجات ملی تو چند ہی دنوں میں وہ ایک بالکل ہی نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا جس نے مولوی سبحان اللہ کے ظلم و ستم کو بھی بھلا دیا۔ لالہ نتھا مل جو پہلے 'نتھو بنیہ' کہے جاتے تھے۔ انھوں نے قصبہ کے باہر اینٹوں کا ایک بھٹا لگا دیا! مزدوری کم دینے کے لئے لالہ صاحب جوانوں کے بجائے لڑکوں کو رکھتے اس سے دام کم خرچ ہوتے اور کام چوکھا ہوتا۔ لالہ لڑکوں سے محنت خوب دھانس دھانس کر لیتے۔ ان پر خوب اینٹیں لدواتے ایک ایک بوجھ میں چودہ چودہ سولہ سولہ اور پھر ہر وقت ایک ڈنڈا ہاتھ میں رکھتے ادھر کوئی اینٹ گری اور ادھر دھنوں سے ڈنڈا پڑا۔ ادھر ذرا سی دیر ہوئی اور ادھر انھوں نے لدائیں بیس اینٹیں۔ اور پھر اگر سورج نکلنے سے قبل کام پر نہ پہونچ جاؤ تو فوراً مزدوری کٹ جائے۔ دوپہر میں کھانا کھانے کے لیے صرف پل بھر کی مہلت ملتی۔ ذرا سی دیر ہو جائے تو مزدوری الگ کٹے اور مار الگ پڑے۔ اور پھر ان تمام باتوں کی مزدوری آٹھویں روز ایک روپیہ!! جس دن مزدوری ملنے والی ہوتی اس روز ایک گھڑی دن رہے خیراتی کا باپ بھٹے پر پہونچ جاتا۔ لالہ جی مزدوری کا روپیہ اس کے ہاتھ میں دے دیتے اور خیراتی منھ تکتا ہی رہ جاتا۔ اگر کچھ پیسے کٹ جاتے اور مزدوری ایک روپئے سے کم ہوتی تو خیراتی کا باپ بلبلا اٹھتا اور گھر پر آکر خیراتی کو خوب دھنکتا۔

دو ڈھائی برس تک خیراتی اسی طرح مرتا اور پٹتا رہا لیکن پھر شاید لالہ جی کو ترس آگیا۔ انھوں نے ایک دن اس سے کہا "ابے او سور کے بچّے! اب کل سے تو کام پر نہ آئیو۔ نمک حرام۔ کام چور! بہت موٹا ہوا ہو کھا کھا کر۔ ہم نے دوسرا انتظام کرلیا ہو۔ اب تیرے ایسے حرام خوروں کی ضرورت نہیں!"

خیراتی اب پندرہ برس کا تھا اور اپنے ہاتھ منھ کا ہوگیا تھا۔ لیکن اس کا باپ اب بھی ہر وقت لٹھ لیے اس پر سوار رہتا اسے دیکھ کر ہر وقت بڑبڑایا کرتا!

"تجھے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آتا ہو۔ نہ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔"

خیراتی نے گھر میں کبھی سکھ نہ دیکھا۔ ہمیشہ روٹی کی ہائے ہائے پڑی رہتی۔ دن میں صرف ایک وقت شام کو چولھا جلتا۔ لیکن دن بھر کی بھوک اس وقت بھی بجھ نہ پاتی خیراتی کے باپ کا دو بیگہ کھیت تھا اور وہ بھی بٹائی پر۔ اتنا بھی غلہ نہ پیدا ہوتا جو گھر کے آٹھ پیٹوں کے لئے گن سے تین چار مہینے بھی چلتا۔ خیراتی کا باپ دن بھر کھیت میں جٹا رہتا۔ بڑا بھائی جمعراتی زمیندار کے یہاں چپراسی تھا۔ تین روپیہ مہینہ اور کھانا ملتا تھا۔ ماں اور تین بہنیں جن میں ایک بیوہ تھی اور دو بن بیاہی جگی پیسا کرتیں یا دھان کوٹتیں یا کبھی کبھی باپ کے ساتھ کھیت پر چلی جاتیں۔ بیوہ بہن کا لڑکا کرمو آٹھ دس برس کا تھا۔ وہ مویشی چرانے جاتا۔ خیراتی کا چھوٹا بھائی پیدائشی لنگڑا، لولا، اندھا اور محض گوشت کا ایک لوتھڑا تھا جو گٹھری بنا پیال پر ایک طرف لیٹا رہتا۔ لیکن بھوک اُسے بھی لگتی اور جس وقت روٹی بٹتی اس کا بھی حصہ لگایا جاتا۔ گھر کا گھر خیراتی سمیت دن بھر کولھو کے بیل کی طرح کام کاج میں لگا رہتا لیکن تب بھی اتنا نہ ہوتا کہ پیٹ بھر کھانے کو موٹا جھوٹا ہی مل جاتا۔

بچے سے الگ ہو جانے کے ایک سال بعد تک خیراتی کو کہیں مزدوری نہیں ملی۔

ندی کے اس پار گاؤں میں سوکھا پڑ گیا تھا اور وہاں کے لوگ محنت مزدوری کرنے جگت پور بھاگ آئے تھے اور چار چار چھ چھ پیسے پر دن بھر ڈلیاں ڈھونے پر تیار تھے۔ خیراتی کے باپ نے اس سے بہت بہت کہا کہ وہ گھاس ہی کھود دے۔ لیکن خیراتی نے مار بھی کھائی اور فاقے بھی کئے لیکن اس سے کچھ نہ ہو سکا۔ وہ دن بھر آوارہ گرد کھیتوں اور اوسروں میں یا پھر قصبہ کی گلیوں اور سڑکوں پر گھوما کرتا۔ ایسے اس کے ہی جیسے چار چھ آوارہ گرد لڑکے اور مل گئے تھے اور ان کے ساتھ اس نے اپنی دلچسپی کا کافی سامان پیدا کر لیا۔ اسے اب کھانے پینے کی بھی مصیبت نہ رہی تھی۔ لڑکوں کی یہ چھوٹی سی فوج کھیتوں اور باغوں پر باقاعدہ دھاوا بولتی اور انھیں لوٹ کھسوٹ کی ہمیشہ کوئی نہ کوئی دعوت رہتی۔ کبھی چنے کے ساگ کی۔ کبھی مٹر کی پھلیوں کی۔ کبھی ککڑیوں کی، کبھی بھٹوں کی، کبھی خربوزوں کی، کبھی تربوزوں کی، بیروں، امرودوں اور آموں کی تو خاص سہالگ تھی۔ ان لڑکوں سے زیادہ شاید گاؤں بھر میں کوئی نہ کھاتا۔ قصبہ میں ان لوگوں کی دال ذرا کم گلتی لیکن پھر بھی گڑ اور مونگ پھلی کے ٹھیلوں سے یہ لوگ کچھ نہ کچھ ضرور ہی غائب کر دیتے۔ ان دھاووں میں کبھی کبھار ایک آدھ ساتھی کمبخت بھی رہتا یعنی "دشمن" کے ہاتھ پڑ جاتا اور خوب خوب اذیتیں اٹھاتا لیکن ہمیشہ مال غنیمت کافی مقدار میں ہاتھ لگتا۔ خیراتی کو یہ زندگی دل سے پسند تھی۔ اس قسم کی زندگی میں عورت کی بھی کمی نہ تھی جس کی ضرورت ہر سولہ سترہ سال کا مرد محسوس کرنے لگتا ہے۔ ارہر کے کھیت تھے۔ پتاور کے کنج تھے، اوسر کی جھاڑیاں تھیں، کھنڈر اور ویران گھروں کے ڈھیر تھے۔ اور پھر سنسان راستے!

شکار کا موقع ہو تو پھر شکار لیتے کیا دیر لگتی ہے!

تب پچھلے رومانوں کی یاد نے خیراتی کے جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا کر دی اور ایک لمبی سی "آہ" بے اختیارانہ اس کے منہ سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر خیراتی کا دل تڑپ کر رہ گیا لیکن پھر وہ اپنی بے کسی کے بے تحاشہ سمندر میں ڈوب گیا۔

ایک دن وہ اور شبراتن۔ وہی شبراتن جو ابھی گھورا ڈال رہی تھی اور اب کلو فقیر کی بیوی اور چھ بچوں کی ماں ہے ـــــ اوکھ کے کھیت میں ایک ساتھ پکڑ لیے گئے!

پھر کیا ہوا ـــــ؟ ہزاروں لاتیں گھونسے اور جوتے جب اس پر برس چکے اور وہ مردہ سمجھ کر ایک طرف سڑک پر ڈال دیا گیا تو وہ لنگڑاتا کراہتا اسٹیشن پہونچا اور بغیر کچھ سوچے سمجھے جو سب سے پہلی گاڑی جگت پور کے اسٹیشن پر رکی اس پہ بیٹھ گیا اور ایک نامعلوم منزل کے لئے روانہ ہو گیا۔

وہ پندرہ برس بعد جگت پور لوٹ کر آیا تھا۔ کیسی کیسی قسمت آزمائی کر کے: لیکن اب بھی موجی کا موجی ہی تھا۔ وہی پرانا خیراتی!!

"اللہ میاں! کیا قصور کیا تھا میں نے؟ اس نے عاجزی سے کہا لیکن یک بیک غصہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "کیوں پیدا کیا تھا آخر مجھے!" وہ بآواز بلند بڑبڑایا۔

دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے اور اس کے رخساروں پر آ کر رک گئے۔ اور سوکھ گئے!

آسمان بھورا ہو چکا تھا۔ گوہ کا ایک غول کائیں کائیں کرتا اس کے سر پر سے نکل گیا!!

راکھ کا ڈھیر

میں تھا۔ رقیہ تھی اور امتیاز، ہم تینوں ایک ساتھ اسکول کی پانچویں جماعت میں پڑھتے۔ صبح سویرے گھر پر ہم لوگوں کو ایک ماسٹر صاحب بھی پڑھانے آتے جو بعض دن اتنے سویرے آجاتے کہ ہم لوگ اپنے اپنے بستروں سے گھسیٹ کر ان کے سامنے لائے جاتے۔ ماسٹر صاحب تھے تو آدمی غصہ ور اور جھکی قسم کے لیکن ان میں ایک بات لاکھ روپیہ کی تھی اور وہ یہ کہ سنیما کے بڑے شوقین اور عاشق زار تھے۔ اکثر ہم لوگوں کو فلم کی کہانیاں سنایا کرتے یا ایکٹرسوں کی تعریف کیا کرتے اور اکثر دوسرا شو دیکھنے کی بدولت پڑھاتے پڑھاتے سو بھی جایا کرتے۔ ان کی یہ عادت ہم لوگوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھی اور جب ان کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور منھ سے ایک آدھ خراٹا نکل جاتا تو ہم لوگ ایک دوسرے سے خوش ہو کر کہتے "ماسٹر صاحب سنیما دیکھ رہے ہیں!"

ایک روز ماسٹر صاحب سنیما دیکھ رہے تھے یعنی سو رہے تھے اور ہم تینوں قرآن شریف کے آموختہ کی طرح گردن اور بیٹھ ہلا ہلا کر اور چیخ چیخ کر انگریزی کتاب کے الفاظ کے معنی یاد کر رہے تھے۔

"او۔ ڈبل اف۔ آئی۔ سی۔ ای۔ آر۔ آفسر۔ آفسر معنی حاکم"۔

"او۔ ڈبل اف۔ آئی۔ سی۔ ای۔ آر۔ آفسر۔ آفسر معنی حاکم"۔

"او۔ ڈبل اف۔ آئی۔ سی۔ ای۔ آر۔ آفسر۔ آفسر معنی حاکم"۔

رقیہ نے ماسٹر صاحب کو غافل دیکھ کر امتیاز کو اشارہ کیا۔ امتیاز نے منھ بنا کر کہنا شروع کیا۔ "او۔ ڈبل اف۔ آئی۔ سی۔ ای۔ آر۔ آفسر۔ آفسر معنی ماسٹر صاحب!"

رقیہ نے اس میں ایک اور جدت کی۔ "او۔ ڈبل اف۔ آئی۔ سی۔ ای۔ آر ماسٹر صاحب۔ ماسٹر صاحب معنی سمٹ گئے"۔ اس کے ساتھ میں بھی بھی چیخنے لگا۔

تھوڑی دیر میں ماسٹر صاحب کے خراٹوں کی آواز بالکل صاف آنے لگی۔ اور ہم لوگوں کو ان کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہو گیا۔ لہٰذا چیخنا چلانا بند کر کے آپس میں ہنسی مذاق کرنے لگے۔

میں نے کہا "ماسٹر صاحب دیووداس دیکھ رہے ہیں"۔

امتیاز نے کہا "ماسٹر صاحب بکار میں ایکٹنگ کر رہے ہیں"۔

رقیہ بولی۔ "ماسٹر صاحب ٹی۔ آئی دیکھ رہے ہیں"۔

ہم تینوں بے اختیار ہنس پڑے۔ امتیاز نے کہا "خوب یاد دلایا تم نے۔ کیوں نہ ماسٹر صاحب کو سچ مچ کی بلی دکھا دی جائے۔ پکڑ لاؤں موتی؟"

موتی ہمارے گھر کی بڑی بد معاش بلی تھی۔ ہر وقت محلے کے تین چار بلوں کو اپنے پیچھے لئے گھوما کرتی۔ اور جس شخص کی گود میں بیٹھ جاتی اُس کا منھ نوچ کھسوٹ کر رکھ دیتی۔

"بہت خفا ہوں گے ماسٹر صاحب"، میں نے کہا۔

رقیہ نے کہا "یہ کیسے معلوم ہو گا کہ بلی خود سے آئی ہے یا لائی گئی ہے —

— ہم لوگ کہہ دیں گے کہ ہم لوگ پڑھ رہے تھے۔ ہم کو نہیں معلوم کہ موتی کہاں سے آئی۔"

امتیاز نے ماسٹر صاحب کی طرف منھ بنا کر کہا "دیکھ لو یہ سنیا۔ ابھی ہم تم کو اصلی سنیما دکھائے دیتے ہیں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مسوتے ہوئے ماسٹر صاحب کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "ماسٹر صاحب ذرا پیشاب کر آؤں" اور موتی کو پکڑنے باہر چلا گیا۔

موتی پکڑ آئی تو ہم لوگوں نے پھر ہل ہل کر چیخنا شروع کر دیا۔ تاکہ ماسٹر صاحب جس وقت ہڑبڑا کر اٹھیں وہ یہی سمجھیں کہ ہم لوگ نہایت جاں فشانی سے اپنا سبق یاد کر رہے ہیں۔" او۔ ڈبل اف۔ آئی۔ سی۔ ای۔ آر۔ آفسر۔ آفسر معنی حاکم۔"

"او۔ ڈبل اف۔ آئی۔ سی۔ ای۔ آر۔ آفسر۔ آفسر معنی حاکم۔"

"او۔ ڈبل اف۔ آئی۔ سی۔ ای۔ آر۔ آفسر۔ آفسر معنی حاکم۔"

جیسے ہی میں نے آخر میں 'حاکم' کہا۔ امتیاز نے موتی کو ماسٹر صاحب پر آہستہ سے چڑھا دیا۔ بلی بھی نہایت حرام زادی تھی اس نے غرا کر ماسٹر صاحب کے داہنے گال پر پنجہ مارا اور لگی ان کے پیٹ اور سینہ کو کھرو چنے۔!

ایک نہایت بھیانک۔ رقت انگیز اور طفلانہ چیخ کے ساتھ ماسٹر صاحب اچھل پڑے۔ بلی کو انھوں نے اٹھا کر پٹک دیا۔ اُن کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ غصہ سے وہ پاگل سے ہو گئے تھے اور اُن کے داہنے رخسارے خون کی ایک ندی سی پھوٹ نکلی۔

ناممکن تھا کہ اس موقع پر ہم لوگ اپنی ہنسی ضبط کر سکتے۔ چناں چہ جسے اور

خوب ہنسے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پٹے اور خوب پٹے۔ ہنستے جاتے اور پٹتے جاتے اور پٹتے جاتے اور ہنستے جاتے، کئی روز تک بڑا مذاق رہا۔ ہم لوگ جب ماسٹر صاحب کو اور اُن کے داہنے گال کا زخم دیکھتے تو ضرور ہنستے اور ظاہر تھا کہ ضرور پٹتے۔ آخر میں ہم لوگ جیتے اور ماسٹر صاحب ہارے یعنی ہم لوگوں نے ہنسنا نہ چھوڑا اور انھوں نے مارنا چھوڑ دیا۔ دانت پیس پیس کر وہ کہتے "میں نے آج تک ایسے بے شرم، بے حیا بے غیرت، ڈھیٹ اور بدتمیز لڑکے نہیں دیکھے۔" اور امتیاز کو دیکھ کر تو ان کی آنکھوں میں خون اُتر آتا۔ اور جلبلا جلبلا کر کہتے۔ "بھیک نہ مانگو تو میرا ذمہ۔ تجھے کبھی علم نہیں آ سکتا۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرے گا تو۔ حرام زادہ۔ بدمعاش۔" اور امتیاز آنکھوں میں آنسو بھر کر معصومانہ انداز میں کہتا۔ "میں کیا کروں ماسٹر صاحب اگر موتی نے آپ کا گال نوچ لیا۔" پھر کھکھلا کر ہنس پڑتا اور ماسٹر صاحب اور بھی زیادہ خفا ہو جاتے۔

کچھ عرصہ میں ماسٹر صاحب کے گال کا زخم اچھا ہو گیا، اور ہم لوگ رفتہ رفتہ بلی والا واقعہ بھولنے لگے۔ اس واقعے سے ہم لوگوں کا ایک بہت زبردست نقصان ہو گیا تھا اور وہ یہ کہ اب ماسٹر صاحب کو کوئی ایسی ہی بڑی مجبوری ہوتی تو سو جاتے ورنہ زیادہ تر ہوشیار رہتے اور بڑی تندہی سے ہم تینوں کا سبق سنتے رقیہ کو سب سے کم۔ اس سے زیادہ مجھ کو اور سب سے زیادہ امتیاز کو مارتے۔ امتیاز بھی ان کی گھات میں لگا رہتا اور طرح طرح سے ان کو پریشان کرتا۔ مثلاً اس نے سارے محلے میں یہ خبر مشہور کر دی کہ ماسٹر صاحب کے گال میں بہت زبردست گھاؤ ہو گیا ہے۔ ہر شخص ماسٹر صاحب سے عیادت کرتا اور گھاؤ کی شان نزول

دریافت کرتا چوں کہ ہم تینوں طالب علموں میں سے ایک نہ ایک ایسے موقعوں پر موجود ضرور ہوتا لہٰذا طوعاً و کرہاً ماسٹر صاحب کو نہایت شرمندگی سے پورا واقعہ بالکل سچ اور صحیح بیان کرنا پڑتا۔ آخر میں تو یہاں تک نوبت پہونچ گئی تھی کہ اس پر ماسٹر صاحب خود کو بھی ہنسی آجاتی۔ یہ بڑا دردناک منظر ہوتا۔

ایک روز رات میں میں اپنے پلنگ پر لیٹا نیند کو بلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ دفعتاً امتیاز آیا اور اس نے مجھ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "ارے سن تو! ایک بڑی اچھی ترکیب سوچی ہے۔ میں نے ماسٹر صاحب کے لیے" میں نے پوچھا "کیا؟"

کہنے لگا "دیکھو جہاں ہم لوگ پڑھتے ہیں وہاں چھت میں ایک روشندان ہے۔"

میں نے کہا "تو پھر کیا؟"

"بڑے گاؤدم ہو یار تم" امتیاز بولا "ذرا سی کوشش سے ہمارے تخت کے ساتھ ماسٹر صاحب کی کرسی اس طرح کھسک سکتی ہے کہ ——— عین روشندان کے نیچے آجائے"۔

"تو پھر کیا؟"

"تمھارے کانوں کے بیچ میں تمھارا سر! بڑے بیوقوف ہو تم"۔

امتیاز مجھے اکثر ڈانٹا کرتا اور میں اس کی ڈانٹ سے خفا نہ ہوتا کیوں کہ بہت سی دوسری باتوں میں وہ میرا بڑا خیال کرتا۔

"آخر کچھ بتاؤ تو سہی"

"کرسی روشن دان کے نیچے آجائے تو پھر کیا مشکل ہے۔ کلّو کو ایک آنہ

دیا جائے اور کل جب ماسٹر صاحب پڑھاتے ہوں، تو وہ اوپر سے ایک لوٹا پانی چھوڑ دے" امتیاز نے کہا۔

"بڑی مار پڑے گی"

"وہ تو یوں بھی پڑتی ہے۔ اور پھر اگر تمھارا جی چاہے تو کل تم نہ پڑھنا اور خالہ کے یہاں چلے جانا"

"رقیہ کو معلوم ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"اصل مزا تو اسی میں ہے جب وہ بھی دنگ رہ جائے۔"

مجھے مجبوراً امتیاز کی بات ماننا پڑی۔ اور دوسرے روز تو نہیں البتہ تیسرے روز ہماری اسکیم مکمل ہو گئی۔ کلوا کو راضی کر لیا گیا۔ وہ ہمارے یہاں ملازم تھا، اور بڑا پاجی لڑکا تھا۔ اور ماسٹر صاحب کی کرسی عین روشن دان کے نیچے بچھا دی گئی۔ میں چاہتا تو اپنی خالہ کے یہاں چلا جاتا کیوں کہ وہ کئی دفعہ مجھے بلوا چکی تھیں کہ ایک روز ماسٹر صاحب سے چھٹی لے کر میرے یہاں چلے آنا لیکن میں محض یہ دیکھنے کے لیے رُک گیا کہ آنے والے سانحہ کا اثر رقیہ پر کیا ہوتا ہے۔

ماسٹر صاحب آئے تو بہت زوروں سے آئے۔ رات کو وہ "ظالم حسینہ" کا فلم دیکھ چکے تھے۔ آتے ہی آتے انھوں نے ہیروئن کی بہادری۔ سفاکی جالاکی عشوہ طرازی اور عاشق نوازی کا قصیدہ چھیڑ دیا۔ انھیں سب سے زیادہ فلم کے گانے پسند تھے اور خصوصاً اس شعر پر تو بڑی دیر تک سر دھنا کیے۔

تم تاروں تاروں تو میں چاند چاند
جاؤں گی سارا آکاشں پھاند

دفعتاً میرے دل پر ایک گری سی پڑی اور آنے والے واقعہ کے خوف سے منہ فق ہوگیا۔ امتیاز دوسری طرف منہ پھیر کر اپنے سر کے بال نوچنے لگا ——

—— کوئی شخص چھت پر چل رہا تھا —— مجھے کچھ خبر نہیں کہ اس وقت ماسٹر صاحب کیا کہہ رہے تھے۔ شاید یہ مصرع پڑھ رہے تھے۔ ع

پریم نگر کے چھینٹے کھاکر پریم ندی میں ڈوبوں گا

—— گھل۔ گھل۔ گھل۔ ایک لوٹا پانی ماسٹر صاحب کے سر پر پڑا —— ماسٹر صاحب شاید اُن انسانوں میں سے تھے جو ایک چُلّو پانی میں ڈوب جاتے ہیں کیوں کہ ایک ہی لوٹے پانی میں ان کا حلیہ بالکل ہی تبدیل ہوگیا اور وہ ایک تند خو ماسٹر سے ایک بھیگا چوہا بن گئے ——

—— رقیہ چیخ اٹھی۔ امتیاز بدحواسی میں بھاگا اور مجھے خبر نہیں کہ کہ میرا کیا حشر ہوا۔

پھر کیا ہوا؟ —— قصہ مختصر یہ کہ ماسٹر صاحب ہم لوگوں کو خوب ٹھونک ٹھانک کر ملازمت سے مستعفی ہوگئے۔ میری والدہ نے مجھے اور رقیہ کو منع کر دیا کہ ہم لوگ امتیاز سے نہ ملیں، لیکن یہ حکم ہم لوگوں کی مسلسل نافرمانیوں کی بنا پر زیادہ دنوں تک نافذ نہیں رہا۔ کلوا کی خوب مرمت ہوئی اور وہ بھاگ گیا۔

میں اور رقیہ میری چچا زاد بہن امتیاز سے بہت زیادہ مانوس تھے

وہ بڑا شریر اور شریف لڑکا تھا جتنی شرارت وہ گھر پر کرتا اُس سے دو گنی شرارت اسکول میں کرتا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھ سے اور رقیہ سے بڑی محبت سے پیش آتا۔ کبھی کوئی چیز تنہا نہ کھاتا اور اکثر ہم لوگوں کی شرارتیں بھی اپنے سر اوڑھ کر ہمارے بجائے مار کھاتا۔ میں انگریزی میں کمزور تھا اور رقیہ حساب میں اور امتیاز ہر مضمون میں انتہائی تیز تھا۔ اس معاملہ بھی وہ ہم لوگوں کی بڑی مدد کرتا۔ رقیہ کا تو معمول سا ہو گیا تھا کہ وہ اپنے گھر کے سوالات امتیاز ہی سے لکھواتی۔

امتیاز کے والد میونسپلٹی میں عمارتوں کے ٹھیکیدار اور ہماری کوٹھی کے بالکل ہی پاس رہتے۔ اس کا کوئی اور بھائی بہن نہیں تھا۔ لہٰذا وہ اپنا کھیل کود کا زیادہ وقت ہم لوگوں ہی کے ساتھ صرف کرتا۔

انٹرنس تک ہم لوگ سب ایک ساتھ رہے۔ لیکن پھر امتیاز کے والد کی مالی حالت بہت سقیم ہو گئی۔ میونسپلٹی کے ممبروں کو رشوت دے کر دوسرے ٹھیکیداروں نے ان کا کاروبار بالکل ہی ختم کر دیا۔ اور وہ مایوس ہو کر ہمارے شہر کو چھوڑ کر کسی دور دراز ضلع میں اپنے وطن چلے گئے۔ امتیاز بھی ان کے ساتھ ہم لوگوں سے رخصت ہو گیا۔

مجھے اور سب سے زیادہ رقیہ کو امتیاز کی جدائی کا بہت صدمہ ہوا جس وقت ریل امتیاز کو لے کر چلی اور اُس نے بڑی حسرت سے کہا "الوداع! اب شاید کبھی نہ مل سکیں" تو میرے آنسو نکل آئے اور رقیہ جو پہلے ہی سے بھری بیٹھی تھی وہ سسکیاں بھر بھر کر بے اختیار رونے لگی ———— مجھے اس دن پہلی بار احساس ہوا کہ اگرچہ رقیہ میری چچا زاد بہن اور منگیتر تھی لیکن وہ مجھے

کہیں زیادہ امتیاز سے قریب تھی۔ اور اگر اس روز امتیاز کہہ دیتا تو یقیناً رقیہ اس کے ساتھ ریل پر بیٹھ جانے کے لیے بھی تیار ہو جاتی

دن جاتے دیر نہیں لگتی اور خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ دنیاوی عیش و عشرت کا سارا ساز و سامان موجود ہو ــــــــــ بیس سال گذر گئے۔ میری رقیہ کے ساتھ شادی ہو گئی اور نہ صرف اپنے والدین سے بلکہ اس کے والدین سے بھی کیوں کہ وہ اپنے گھر کی اکلوتی اولاد تھی۔ مجھے بہت وافر ترکہ جائداد اور تجارت کی صورت میں ملا۔ دولت کی افراط اور اس کی بدولت شہرت کی ارزانی نے میری زندگی کو کشمکش حیات، غربت اور ضروریات کی خاک اور دھول سے پاک کر کے ایک خوشنما خواب یا فلم بنا دیا جس میں ہر چیز حسین تھی اور ہر شے دلکش۔ اپنے کاروبار کی زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی کوشش میں میں نے آبائی وطن کی سکونت ترک کر دی اور کان پور میں آباد ہو گیا۔

امتیاز کا کیا حشر ہوا مجھے کچھ معلوم نہ تھا؟ اور سچ پوچھئے تو میں اس کو کب کا بھول چکا ہوتا اگر اُس کا اور اس کے ساتھ میرا اور رقیہ کا انلارج کیا ہوا فوٹو میرے کھانے کے کمرہ میں عین وسط میں نہ لگا ہوتا۔ اس فوٹو میں ہم تینوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے کھڑے تھے اور امتیاز قہقہہ لگا رہا تھا۔ اس فوٹو کو دیکھ کر میں اکثر رقیہ سے کہہ دیتا۔ "کیا زمانہ تھا وہ بھی؟ شاید پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے ہم لوگ" اور وہ ہنستے ہوئے جواب دیتی "اور تمہیں یاد ہو گا کہ اس فوٹو کے دام امتیاز نے اپنی دھوپ کی عینک بیچ کر ادا کئے تھے" میں جانتا تھا کہ اس جواب

میں ایک خفیف سا اشارہ اس بات کا ہوتا کہ امتیاز میں مجھ سے زیادہ ایثار اور قربانی کا جذبہ موجود تھا۔ اور میں چپ رہتا۔

بہت دفعہ ایسا ہوا کہ رقیہ مجھ سے اچانک پوچھ بیٹھی اور میں گھبرا سا گیا۔

"کیا ہوا امتیاز کو؟"

"مجھے کیا معلوم"

"وہ جہاں ہوگا خوش ہوگا"

"وہ چاہتا تو بہت آسانی سے ہمارا پتہ دریافت کر سکتا" میں کہتا۔

میں خود بھی امتیاز سے ملنے کا متمنی تھا لیکن آخر اسے کہاں ڈھونڈھتا۔ وہ تو جب سے گیا اس طرح کھو گیا تھا۔ جیسے کسی بھولے ہوئے خواب یا فلم کا ہیرو۔

مجھے اپنے دفتر کے لئے ایک سکریٹری کی ضرورت تھی چنانچہ میں نے اخبارات میں اشتہار دیا کہ مجھے ایک بی اے پاس کلرک کی تیس روپیہ ماہوار پر ضرورت ہے۔ رقیہ نے مجھے ٹوکا کہ کسی گریجویٹ کو تیس روپیہ ماہوار پر رکھنا سخت ذلیل حرکت ہوگی اور شائد کوئی خود دار گریجویٹ اس اشتہار کے جواب میں اپنی درخواست نہ بھیجے لیکن میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ تجارتی معاملات میں جذبات نہیں چلتے۔ جب ایک چیز ہم کو تیس روپیہ میں مل سکتی ہو تو اس کے لئے ہم پچاس یا ساٹھ روپے کیوں خرچ کریں۔ میری رائے صحیح نکلی۔ اور رقیہ کی غلط۔ مجھے اپنے اشتہار کے جواب میں کم و بیش ساڑھے تین سو درخواستیں موصول ہوئیں۔ امیدواروں میں نہ صرف بی اے پاس تھے بلکہ زیادہ تر ایم اے اور ایل، ایل، بی اور پھر بی۔ اے پاس بھی عموماً معمولی گریجویٹ

نہ تھے بلکہ کوئی شاعر تھا تو کوئی ادیب۔ ایک امیدوار نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ نہ صرف وہ بلکہ ان کی بیوی بھی جو انٹرنس پاس تھیں اسی تنخواہ میں ملازمت کرنے کے لئے تیار ہیں بعض ضرورت مندوں نے تو بُجاجت سے لکھا تھا کہ تیس روپیہ کیا وہ بیس اور پندرہ روپیوں پر ملازمت کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ ان درخواستوں میں سے سب سے بہتر امیدوار کا انتخاب کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ لہٰذا میں نے یہ مصیبت رقیہ کے سر تھوپ دی۔ اس نے بڑی محنت اور سر زنی بلکہ سفاکی اور بے انصافی کے بعد صرف پانچ درخواستیں چھانٹیں اور مجھ سے کہنے لگی "اب انتخاب ناممکن ہے" "آپ کرایہ بھیج کر ان پانچوں کو بلوائیے اور پھر ان میں سے ایک کا انتخاب کر لیجئے۔" میں نے ایسا ہی کیا اور ایک شخص کو منتخب کر لیا۔

انتخاب کے دوسرے روز میں حسب معمول سویرے برآمدہ والے کمرہ میں بیٹھا تھا، میں نے سُنا کہ چپراسی ایک شخص پر بڑبڑا رہا ہے، اور وہ شخص گڑگڑا کر مجھ سے ملنے کی درخواست کر رہا ہے۔ چپراسی کہہ رہا تھا "جائیے آپ کے ایسے بیسوں آیا کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ بڑے آدمیوں سے ملنے کا وقت کیا ہوتا ہے، شام کو آئیے گا پانچ بجے!" مجھے چپراسی کی بدتمیزی پر بڑا غصہ آیا اور میں نے پکار کر کہا۔ "کون صاحب ہیں؟ بھیج دو"

چق اٹھی اور ایک شخص نمودار ہوا جس نے دروازہ ہی پر سے مجھے ایک زمیں بوس سلام کیا۔ میں نے سر کے اشارے سے جواب دیا ———۔ کشتی دار ٹوپی جس پر دو دو انگل تیل اور گندگی کے دھبے تھے۔ دا کلٹ سے گھٹنوں نیچا بوسیدہ کوٹ جس میں ایک بھی بٹن نہ تھا۔ چھوٹی سی چست پتلون جس کو

پہن کر شاید کبھی دفعہ فٹ بال پر سو یا گیا تھا کیوں کہ اس پر بے شمار شکنیں تھیں اور گرد اور کیچڑ کے دھبوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ربر کا جوتا جس کا منھ پھٹا ہوا تھا اور جس میں سے انگوٹھے باہر جھانک رہے تھے۔ پہنے ہوئے ایک نہایت مسکین صورت شخص میرے سامنے کھڑا تھا —— میں اس شخص کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس بوسیدہ اور ذلیل ساز و سامان کے باوجود اس کے چہرہ سے ذکاوت اور محنت ٹپکتی اور اس سے کچھ انسیت معلوم ہوتی۔

"کیا چاہتے ہیں آپ؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو شاید ایک کلرک کی ضرورت تھی" اس شخص نے نہایت عاجزی سے کہا۔

"جی! تو پھر"

"مجھے افسوس ہے کہ میں وقت پر اپنی درخواست پیش نہ کر سکا۔ اب میں خود حاضر ہو گیا ہوں۔"

"لیکن اس جگہ کے لیے تو ایک گریجویٹ کی ضرورت تھی" میں نے کہا۔

"میں ایم۔ اے ہوں معاشیات میں" وہ شخص کچھ اس طرح سے کہہ رہا تھا گویا اپنی کسی حماقت پر نادم ہے۔

مجھے یہ سن کر بڑا اچنبھا ہوا اور ساتھ ہی ساتھ مایوسی بھی۔ میں نے بات ختم کرنے کے لیے کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ ایک روز دیر سے پہونچے۔ میں نے کل آخری انتخاب ختم کر دیا۔"

اس شخص کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ جانے کے لیے مڑا لیکن

پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ "کیا آپ کسی اور خدمت پر مجھے تعینات کر سکتے ہیں۔ میں بہت زیادہ ضرورت مند ہوں۔"

مجھے اس شخص سے کچھ ہمدردی معلوم ہوئی، اور میں نے پوچھا۔ "اسم مبارک آپ کا۔"

"خاکسار کو امتیاز احمد کہتے ہیں"

"امتیاز احمد!" میں نے غور سے اس شخص کی طرف دیکھا اور پھر ایکدم سے اٹھ کر دوڑا اور اس سے لپٹ گیا۔ "امتیاز! امتیاز! مجھے معاف کر دو خدارا۔ میں نے بالکل نہیں پہچانا۔"

میری اس مجنونانہ حرکت پر امتیاز کانپ اٹھا۔ "حضور! غلط فہمی ہوئی آپ کو" وہ گڑگڑایا۔

"بس کرو یہ دنیا سازی! امتیاز! امتیاز۔ تم واپس آ گئے! میرے عزیز ترین دوست!" میں چیخا۔ میں امتیاز کو صوفہ پر گھسیٹ لے گیا اور لے کے اپنے پاس بٹھایا۔ لیکن وہ کھسک کر تھوڑا ہٹ گیا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے میلے چیکٹ کپڑے میرے معطر لباس سے مس نہ ہو جائیں۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "ارے بھول گئے اپنے بھوندو سلیم اللہ کو" بچپن میں امتیاز مجھے اکثر بھوندو کہا کرتا۔

امتیاز کے منہ سے ایک سسکی نکل گئی اور وہ صرف اسقدر کہہ سکا "رقیہ بیگم صاحبہ"! میں نے وفورِ محبت سے ایک دفعہ پھر امتیاز کو چمٹا لیا۔ لیکن وہ دوبارہ کانپ اٹھا۔

"کہاں رہے یار تم اتنے دنوں؟" میں نے پوچھا۔

امتیاز کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک چشمہ اُبل پڑا اور وہ چھوٹے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ مجھے اپنے سوال پر بڑی ندامت ہوئی۔ یہاں صورت بہیں حالت میر بیں کا مضمون تھا۔ "رقیہ آرہی ہے۔ ابھی موٹر پر بازار گئی ہے" میں نے کہا۔

میرے اس کہنے سے امتیاز اور زیادہ بے چین ہوگیا۔ "اچھا اب اجازت دیجئے۔ پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔" اُس نے کہا۔

"ناشتہ لے آؤ" میں نے ملازم کو آواز دی اور امتیاز کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔

"کس قسم کے انسان ہو تم امتیاز! اتنی مدّت کے بعد تو ملے ہو۔ اور اس بے رخی سے پیش آرہے ہو۔ آخر کہاں جا رہے ہو تم؟ اب کہیں نہ جاؤ۔ تم رہو یہیں میرے ساتھ۔"

میں لاکھ جھنجھوڑتا لیکن امتیاز ایک نعش کی طرح بے حس اور بے جان تھا۔ غربت اور بے کسی کے جلائے ہوئے خاکستر میں ایک چنگاری بھی باقی نہ تھی۔ امتیاز جو میرے ساتھ پڑھا تھا مر چکا تھا۔ اور اب اُس کے بجائے میرے سامنے کوئی دوسرا شخص تھا جس نے بیس برس زمانہ کی ٹھوکریں اور ذلتیں اٹھائی تھیں اور جس کا رواں رواں ایک مرقع عبرت تھا۔ کیا بدل دیتا ہے زمانہ انسان کو!

باہر آغوش میں موٹر رکی اور رقیہ تیز قدموں زینہ پر چڑھتی چلی گئی۔ میں

اس کے پیچھے دوڑا۔ "رقیہ۔ رقیہ۔ ذرا سنو تو۔"

"کیا ہے؟" اُس نے ایک نگاہ غلط انداز سے میری طرف مڑ کر دیکھا۔

"امتیاز آ گیا ہے" میں نے کہا۔

"امتیاز!" وہ چیخی "کہاں ہے؟"

"میرے کمرہ میں"

رقیہ ایک دم سے میرے کمرہ کی طرف بھاگی۔ "امتیاز! امتیاز! امتیاز! تم آ گئے!"

رقیہ چچ سمیت میرے کمرہ میں گھس گئی —— وہیں امتیاز تھا۔ کو چے کے ایک کونے میں دبکا ہوا بے حس و حرکت! دونوں کی آنکھیں ملیں اور رقیہ کے ہاتھ سے اس کا بٹوا گر پڑا۔

غلام

بلجیم کی سرحد کے قریب فرانس کے شمال مشرق کے وسیع میدان لالہ زار میں جہاں کبھی لہلہاتے کھیتوں اور تر و تازہ سبزوں پر سکھ اور چین کی خوبصورت دوشیزہ پھولوں اور شبنم کی بارش کرتی اور جہاں آج انسانی خون کا پیاسا جنگ و جدل کا دیوتا ملک گیری اور ہوس رانی کا خونی کھیل کھیل رہا تھا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا شفق سرخ تھی بالکل خون کی طرح اور آفتاب آسمان پر ایک ایسا تازہ زخم معلوم ہوتا جس سے ابھی خون ابل رہا ہو۔

گولیوں کی سنسناہٹ اور گھن گرج توپوں کی گونجتی ہوئی آواز اب تھوڑے عرصہ سے بند تھی۔ معلوم ہوتا دن بھر کی مصروفیت کے بعد موت بھی چند لمحوں کے لئے سانس لینے کو ٹھہر گئی تھی۔ فضا خاموش معلوم ہوتی۔ مسلسل آٹھ گھنٹوں سے خندق کے سپاہیوں پر جو بے حسی طاری تھی وہ رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی۔ اور ابھی تک جو وہ مشین گنوں اور بندوقوں کے پرزے بنے ہوئے تھے اور ان میں سوائے مر جانے اور مار ڈالنے کے کوئی دوسرا شعور نہ تھا۔ اس شعور کی تاریک اور غلیظ فضا میں بھی اس احساس کی شعاعیں پیدا ہونے لگیں کہ وہ بھی انسان

ہیں اور گوشت اور خون سے بنے ہیں۔ اب وہ توپوں کی گرج ، بندوقوں کی آواز اور بموں کے دھماکے نہیں سُن رہے تھے۔ وہ کچھ دوسری باتیں بھی سننے کے لئے متوجہ ہوئے۔ انھوں نے اپنی بندوقوں کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ اور درد کرتی ہوئی انگلیوں کو پھیلانے لگے۔ انھوں نے اپنی ان آنکھوں کو جو ایک مدت سے صرف دشمن کی طرف سے آتی ہوئی گولیوں اور گولوں کو دیکھ رہی تھیں اپنے ساتھیوں کی طرف پھیرا اور اُن کے بھیانک۔ اور خوف زدہ چہروں کو دیکھا اور بعضوں نے تو بات کرنے کی بھی کوشش کی۔ سپاہیوں میں کچھ حرکت پیدا ہوئی اور وہ ادھر ادھر خندق میں جنبش کرنے لگے۔

یوسف خاں کا بدن تھکاوٹ سے چور چور تھا۔ ہر عضو میں اس شدت کا درد تھا کہ اگر لڑائی کا میدان نہ ہوتا تو وہ گلا پھاڑ کر چیختا اور کراہتا لیکن یہاں خندق میں وہ بے چارہ کیا کر سکتا ؟ اس وقت اُسے اپنے گھر کی وہ ٹوٹی ہوئی چارپائی یاد آئی جس پر وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سویا کرتا اور جس کو وہ نفرت سے ٹھکرا کر چند چاندی کے سکّوں کی خاطر آگ اور خون کے طوفان میں کھڑا تھا۔ گھر کی یاد نے اس کے دل میں ایک نشتر سا چبھو دیا۔ بے اختیار اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ خندق سے نکل کر باہر زمین پر چت لیٹ گیا۔ اسے خیال آیا کہ نہ معلوم اس کی زہرہ اور بچے کس حال میں ہوں گے۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ کچھ بھی ہو وہ اس سے تو بہتر ہی حالت میں ہوں گے۔ ان کو دیکھنے کے لئے اس کا دل تڑپ گیا۔ وہ بیتاب ہو گیا۔ اس کا بس نہ چلتا ورنہ وہ پر لگا کر اپنے گھر پہونچ جاتا۔ وہ ان ہی خیالات میں الجھا ہوا بار بار اپنے آس پاس کے ساتھیوں کی

نظریں بچا کر اپنے امنڈتے ہوئے آنسو پونچھ رہا تھا کہ دفعتاً اس نے ایک قہقہہ سنا۔

قہقہہ! اس گھناؤنی اور مسموم فضا میں قہقہہ! وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ جیسے کوئی توپ اُس کے کان کے پاس داغ دی گئی ہو۔ اس نے دیکھا کہ پاس ہی خندق میں جہپال سنگھ چند ساتھیوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ اور کچھ ایسی باتیں کر رہا تھا جس سے صاف معلوم ہوتا کہ اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔ یوسف خاں ...... غصہ کے مارے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے اپنی بندوق کی طرف ہاتھ لپکایا۔ لیکن پھر کچھ سمجھ کر رک گیا۔ اسے اگر دنیا میں کسی شخص سے نفرت تھی تو وہ جہپال سے۔ وہ جہپال کو اچھی طرح جانتا اور اس کی چھچھوری طبیعت اور بغض اور عداوت سے خوب واقف تھا۔ جہپال اور اس سے بچپن کی دشمنی تھی۔ جب تک دونوں اسکول میں رہے ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہے اس کے بعد جب آپس کی مار پیٹ کے سلسلے میں دونوں کا نام اسکول سے خارج ہو گیا تو پھر دونوں لڑنے جھگڑنے کے لیے بالکل آزاد ہو گئے۔ قصبہ میں جو فرقہ وارانہ فساد ہوا وہ ان ہی دونوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ جہپال یوسف خاں سے کبھی جیت تو پایا نہیں لیکن وہ یوسف خاں کی غیبت کر کے اس کا مذاق اڑا کر اس کو گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتا! دہشت ناک دھماکوں اور دھڑاکوں اور زندگی کی بے پناہ خرابیوں کے درمیان وہ آج کل ایک ہی پلٹن میں تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنا بھی پسند نہ کرتے۔ ہر طرف گولے اور گولیوں کی بوچھار تھی۔ موت ہر وقت سر پر منڈلا رہی تھی۔ لیکن تب بھی ایک دوسرے کے دل میں انتقام اور بدلہ لینے کی آگ سلگ رہی تھی۔

بڑی دیر تک یوسف خاں خندق کے باہر زمین پر چت لیٹا رہا۔ اسے مہپال کا قہقہہ نہ بھولتا۔ وہ یہی خیال دوڑاتا رہا کہ کس طرح مہپال کو اس کی اس بد تہذیبی اور بیہودگی کا مزا چکھا دیا جائے۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ دن بھر کے تھکے ماندے سپاہی خندق میں دبکے اونگھ رہے تھے ——— دفعتاً دشمنوں کے بمبار طیاروں نے بالکل اچانک حملہ کر دیا۔ قبل اس کے کہ بیچارے سپاہی سمجھ بھی سکتے کہ کیا معاملہ ہے بمبار طیارے طوفانی تیزی کے ساتھ ان کے سروں پر آ پہونچے۔ سارے آسمان پر طیارے ہی طیارے دکھائی پڑتے۔ خندق کا انھوں نے پتہ لگا لیا تھا جاسوسی روشنی سپاہیوں کی آنکھوں کو خیرہ کیے دیتی اور پھر چاندنی اتنی صاف چھٹکی ہوئی تھی کہ بیچارے نہ تو چھپ سکتے اور نہ بھاگ ہی سکتے۔

چاندنی کتنی معصوم اور حسین تھی لیکن اسی کی مدد سے کس قدر رقت انگیز درندگی کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ طیارے موسلا دھار بارش کی طرح خندق پر بم برسا رہے تھے۔ ہر بم کے ساتھ ایک دہشت ناک دھماکہ ہوتا اور ساتھ ہی چند چیخوں کی آواز آتی اس کے بعد مقتولین کے اعضا ہوا میں اُڑتے ہوئے دکھائی دیتے۔ خندق کے سپاہی بالکل بے کس اور لاچار تھے۔ ہر سپاہی ہر لحظہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے سر پر اب بم گرا!! اپنی موت کا اُسے یقین تھا اور ایک قسم کی بے چینی کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ وہ یہ بھی سوچتا کہ بفرض محال بم کی زد سے بچ بھی گیا تو خاک دھوئیں اور بارود کی بدبو سے جو اس کا گلا گھونٹ

رہی تھیں کیسے جانبر ہو سکے گا۔ طیارے سپاہیوں کو اس طرح مار رہے تھے جیسے مکھی کے کاغذ پر چپکی ہوئی مکھیوں کو کوئی اپنے پیروں سے روندے۔

جس طرح خوف زدہ مسافر اپنی زندگی سے نا امید ہو کر ڈوبتے ہوئے جہاز سے سمندر میں کود پڑتا ہو اسی طرح یک بیک خندق کے سپاہی بھی دیوانہ وار خندق سے نکل کر کھلے میدان میں ہر چہار طرف بھاگنے لگے۔ ہوائی طیاروں کی شکل میں موت ان کا تعاقب کر رہی تھی۔

خندق سے جو مٹھی بھر سپاہی بھاگے تھے ان میں یوسف خاں بھی تھا۔ بیچارہ بالکل ہی بدحواس اپنی جان بچانے کی امید موہوم لئے سر پر پاؤں رکھے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ نہ معلوم کہاں؟ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ میں تنہا ہوں یا میرے ساتھ کچھ لوگ اور بھی ہیں۔ دفعتاً اسے ٹھوکر لگی اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ اسے ہوش آیا تو وہ گھبرا کر بھاگنے کی فکر کرنے لگا۔ اسے وہی خیال تھا کہ بمبار طیارے اس کا تعاقب کر رہے ہیں لیکن اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا تو دھندلا دھندلا سویرا ہو چکا تھا۔ آسمان صاف تھا اور کئی لوگ سفید سفید کپڑے پہنے ہوئے میدان میں ادھر اُدھر پڑے ہوئے سپاہیوں کو اسٹریچر پر ڈال کر کہیں لئے جا رہے تھے۔ وہ نقاہت کی وجہ سے اُٹھ کر پھر گر پڑا لیکن وہ ہمت کر کے پھر اُٹھا اور ایک طرف چلنے لگا۔ اس کے سامنے ایک زخمی سپاہی اسٹریچر پر لے جایا جا رہا تھا۔ یک بیک ایک افسر لپکتا ہوا اسٹریچر کے قریب آیا اور پوچھا "کون ہے۔"

قبل اس کے کہ اس کو جواب دیا جاتا اس نے زخمی سپاہی کو دیکھ کر کہا

"یہ ہے۔ اسے ڈال دو۔ ایک انگریزی سپاہی زخمی پڑا ہے۔ چلیے جلدی کیجیے وہاں کیمپ کے قریب۔"

زخمی سپاہی زمین پر ڈال دیا گیا۔ اور اسٹریچر والے افسر کے ساتھ دوڑتے ہوئے کیمپ کی طرف چلے گئے۔

اس حادثہ سے یوسف خاں کے دل پر بڑا اثر ہوا وہ اس خود غرضی کو دیکھ کر کہ ایک سپاہی کی زندگی دوسرے سپاہی کی زندگی سے زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے۔ اور وہ بھی محض اس لیے کہ وہ انگریز ہے جھنجلا سا گیا اور اسے غصہ آگیا۔

زخمی سپاہی پر جاں کنی کی کیفیت طاری تھی۔ اس کا سارا جسم پھڑک رہا تھا۔ یوسف خاں نے جھک کر غور سے دیکھا تو یہ مہپال کی پھڑکتی ہوئی نعش تھی۔ اس موقع پر یوسف خاں مہپال سے اپنا سارا بغض و عداوت بھول گیا وہ اس کی پھڑکتی ہوئی نعش میں اپنے وطن ہندستان کی پھڑکتی ہوئی نعش دیکھ رہا تھا۔ وہ وہیں زمین پر دو زانو بیٹھ گیا اور اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔

سکرا کی طرف

امید و بیم کے متضاد جذبات اس کے دل سے کھیل رہے تھے۔ کبھی تو وہ مارے خوشی کے اچھلنے لگتا۔ اور کبھی وہ خوف سے اس قدر زور زور سے دھڑکتا کہ معلوم ہوتا سینہ سے نکل بھاگے گا۔ کبھی وہ سوچتی کہ اس کی سہیلیاں اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گی۔ اُسے ہنسائیں گی۔ گدگدائیں گی۔ اس سے لپٹیں گی۔ اسے ماریں گی اسے بہت سی باتیں بتائیں گی۔ اور کبھی وہ سوچتی کہ اسے دیکھتے ہی گاؤں کے بڑے بوڑھے نفرت سے منہ پھیر لیں گے اور اس کی طرف اشارہ کر کر کے اپنی لڑکیوں کو منع کریں گے کہ خبردار اس سے نہ ملیں۔ کبھی وہ ان خوشگوار دنوں کو یاد کرتی جب وہ دن بھر اپنی سہیلیوں کے ساتھ باغوں، اور جنگلوں میں گھوما کرتی اور شام کو الاؤ کے گرد قصے کہانیوں کا وہ تانتا بندھتا کہ وہ سنتے سنتے کسی سہیلی کی گود میں سو جاتی۔ اور کبھی وہ ان دنوں کے خیال ہی سے کانپ جاتی جب گاؤں کا بچہ بچہ اس پر آوازے کستا اور گھر گھر میں اس کا ذکر کر کے اسے لعنت ملامت کی جاتی۔

وہ سال بھر کے بعد آہستہ آہستہ اپنے گاؤں کی طرف جا رہی تھی یہ سال

کس طرح گذرا یہ کچھ اسی کا دل خوب جانتا تھا۔ بھوک، بیماری کام کی زیادتی، مار۔ شائد ہی کوئی جسمانی اذیت بچ رہی ہو جو اس پر نہ بیت چکی ہو اور پھر اس کے دل کو کیسا کیسا مسوسا اور جلایا گیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے اسے کیا کیا ذلیل و شرمندہ کیا گیا تھا۔ اور پھر وہ کیسی بے یار و مددگار تھی۔ انہوں نے غیروں سے بدتر برتاؤ کیا تھا۔ ماں۔ باپ۔ بھائی بہن کسی نے کبھی تو بھولے سے نہ پوچھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر گئی۔ وہ تو جیسے اس سے چھٹکارا ہی پانا چاہتے تھے۔ پریا بار بار اپنی ساری کے آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی۔ ایک سال کے پچھلے واقعات ایک ایک کرکے اس کے سامنے آتے جاتے اور شدت غم سے اس کے دل میں نشتر سے چبھ چبھ کر ٹوٹ جاتے بار بار وہ کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ جاتی اور خوب جی بھر کر روتی۔ پچھلی مصیبتوں نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ لیکن پھر بھی گھر جاتے ہوئے اس کی ڈھارس سی بندھی ہوئی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ لاکھ گھر والے خفا ہوں لیکن تب بھی وہ غیروں سے تو بہتر ہی ہیں۔ وہ کام لیتے لیتے اُسے جان سے تو نہ مار ڈالیں گے۔ وہ جب خود کھائیں گے تو کم از کم اسے بھوکا تو نہ رکھیں گے۔ بھائی برسوں سے نوکری پر گیا ہوا تھا۔ مدت سے اسے نہ دیکھا تھا وہ پہلے اس سے کتنا پریم کرتا تھا۔ کچھ نہ کچھ وہی اس کا خیال کرے گا۔ بڈھی ماں کیا اُسے دُھتکار دے گی۔ باپو کے قدموں سے لپٹ جائے گی تو پھر آخر باپ ہیں کچھ تو رحم آ ہی جائے گا۔

وہ گاؤں کی سرحد پر آ پہونچی۔ یہاں ایک برگد کا درخت تھا اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرا ہو چلا تھا ہر طرف سناٹا تھا۔ وہ ذرا دم لینے کے لئے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ درخت کو اس نے خوب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا یہ ہی

برگد کا درخت تھا جس کے سایہ میں وہ گائیں اور بھینسیں چراتے چراتے تھک کر ستانے کے لئے بیٹھ جاتی۔ اسی کے نیچے وہ اور اس کی سہیلیاں کھیلتیں، شور کرتیں، ایک دوسرے سے لڑتیں، روٹھتیں، ہنستیں، باتیں کرتیں اور اسی درخت کے نیچے رامو نے اس کو منھ دکھانے کے قابل نہ رکھا تھا۔ پریا کے دل پر سانپ سا لوٹ گیا۔ ارے بھگوان وہ کیا تھی اور کیا ہو گئی! یہ کیوں؟ ایک وہ دن تھا کہ وہ دن بھر کھیلتی، سہیلیوں کی سردار بنتی۔ ماں باپ سے ضد کرتی۔ سب بلا کر اسے اپنے پاس بٹھاتے۔ جہاں جاتی خود بھی ہنستی اور دوسروں کو بھی ہنساتی۔ جتنا چاہتی کھاتی جو چاہتی پہنتی جو چاہتی کرتی۔ بڑے بڑے مالدار گاؤں والے اسے بہو بنانے کی تمنائیں کرتے۔ گاؤں کا ہر نوجوان اس سے بات کرنا اپنی بہشت سمجھتا اور وہ گاؤں بھر کو چٹکیوں پر اڑاتی پھرتی۔ اچکتی، کودتی، پھاندتی، اور ایک یہ دن ہے کہ وہ گاؤں جاتے ڈرتی ہے۔ اس کا دل ٹوٹا جاتا ہے۔ وہ قدم قدم پر پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔ سال بھر میں اس پر کیا کچھ تکلیفیں اور مصیبتیں گذر چکیں، اور کوئی اس سے ہمدردی کرنے والا نہیں۔ بلکہ سب شناسا نفرت و ملامت کے تیر لئے بیٹھے ہیں کہ وہ گاؤں پہونچے اور اس کا شکار کیا جائے۔ یہ کیوں ہوا؟ یہ اتنی جلد دنیا کیسے بدل گئی؟۔

گاؤں میں رامو بڑا بانکا جوان تھا۔ ایک مدت سے وہ پریا پر مرتا تھا۔ پریا اسے منھ نہ لگاتی تھی اور اپنے دوسرے چاہنے والوں کی طرح وہ اس کا بھی مذاق اڑاتی لیکن رامو دوسرے قماش کا آدمی تھا وہ پریا کی بے التفاتیوں سے بد دل نہ ہوا بلکہ وہ اس کا پیچھا کرتا ہی رہا۔ اسے واقعی پریا سے محبت تھی لیکن چونکہ بے چارہ غریب آدمی تھا لہذا اتنی جرأت نہ کر سکتا کہ پریا کے باپ سے

شادی کی درخواست کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کا خلوص دیکھ کر پریا کو بھی اس سے ایک قسم کا لگاؤ ہو گیا۔ اس لگاؤ نے بڑھتے بڑھتے ایک دوسری شکل اختیار کر لی جوانی دیوانی مشہور ہی ہے اس کے طوفان کو کون روک سکتا ہے۔ ناتجربہ کار پریا اور رامو اس میں تنکے کی طرح بہتے چلے گئے اور محبت کی تیز و تند شراب نے ان لوگوں کو کچھ ایسا آپے سے باہر کیا کہ سماج اور سوسائٹی کی قید و بند کی زنجیروں کو ایک ہی جھٹکے میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ان بیچاری معصوم ہستیوں کو کیا خبر تھی کہ گلستاں سمجھ کر کس آگ میں کود رہے ہیں۔ قدرت کو بھی اس راز کو پوشیدہ رکھنا منظور نہ تھا۔ گاؤں والوں کو جب خبر ہوئی کہ پریا عن قریب ایک بچے کی ماں بننے والی ہے تو ہر چہار طرف سے ملامت، نفرت، حقارت، ذلت کے نشتروں، بھالوں، تیروں، شمشیروں، کی بارش کرنے لگے۔ بیچاری پریا کو اس کے گھر والوں تک نے امان دینے سے انکار کر دیا۔ ماں باپ تک نے آنکھیں پھیر لیں انھیں اپنی عزت پیاری تھی، لڑکی ان کے لئے کیا چیز تھی۔ انھوں نے وہ اذیتیں پہنچائیں کہ غیر کیا پہنچائیں گے۔ گاؤں بھر میں صرف ایک رامو کو ہمدردی تھی۔ لیکن وہ بیچارہ کیا کر سکتا تھا وہ خود سماج کے ہتھیاروں کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ گاؤں کے زمیندار نے پریا کے باپ سے کچھ روپیہ لے کر اسے کسی جھگڑے فساد کے مقدمہ میں ماخوذ کرا دیا تھا۔ اور اس کو کئی سال کی سزا ہو گئی۔ پریا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پانے کے لئے اس کے باپ نے اس کو شہر کے ایک بے درد رشتہ دار کے سپرد کر دیا تھا۔ اس رشتہ دار نے جو جو ظلم و ستم کئے تھے اس کو یاد کر کے پریا کا ایک ایک رونگٹا کانپنے لگا۔ آج وہ اسی کے پاس سے بھاگی ہوئی کچھ ٹوٹی امیدیں

سینے سے لگائے اپنے گاؤں جا رہی تھی۔

پریا کے خیالات کا جب تانتا ٹوٹا تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی گاؤں کے کئی لوگ ملے جنھیں پریا نے پہچان لیا۔ لیکن خوش قسمتی سے انھوں نے اس کو نہیں پہچانا اور اس کی طرف مخاطب ہوئے بغیر اپنے راستے چلے گئے۔ پریا گاؤں کی ہر ہر چیز بڑے غور سے دیکھتی۔ اُسے ہر چیز ویسی ہی معلوم ہوتی جیسی کہ اُس نے چھوڑی تھی۔ ہاں کچھ تبدیلیاں ضرور ہو گئی تھیں۔ نرائن بابو کا دروازہ نیا لگ گیا تھا۔ اور کرُمے کا گھر بالکل اُجاڑ تھا۔ نتھو کے یہاں ایک دوسری گائے آ گئی تھی۔ اور فقیرے کی بھینس اپنے کھوٹے سے غائب تھی۔

پریا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے گھر کی کنڈی ہلائی۔ اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ اس نے کان لگا کر سنا! اس کا بھائی جس کو اس نے برسوں سے نہ دیکھا تھا زور زور سے کچھ بول رہا تھا۔ پریا بیتاب تھی کہ وہ بھائی سے لپٹ جائے اس نے ہمت کر کے پھر کنڈی ہلائی۔ "کون ہو؟" کی ایک گرج دار آواز سنائی دی۔ پریا ڈر گئی۔ لیکن اس نے بڑی معصومیت اور آہستگی سے جواب دیا۔

"پریا"

"کون؟" اندر سے پھر آواز آئی اور کسی نے آکر دروازہ کی زنجیر ہٹائی اور پٹ کھول دیئے۔

پریا کا بھائی رگھوناتھ اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ پریا سے ضبط نہ ہو سکا وہ جھپٹ کر بھائی سے لپٹ گئی اور بے اختیار سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ چند سکنڈ تو رگھوناتھ مبہوت کھڑا رہا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ کیا معاملہ ہو۔ اس کے بعد اُسے خیال آیا۔

پریما بڑی بے کسی سے رو رہی تھی۔ لیکن اس نے اسے اپنے سے علیحدہ پیچھے ہٹا دیا۔ "منھ کالا کر کے اب پھر آئی ہو" وہ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔ پریما دروازہ سے لپٹی روتی رہی۔ بالآخر بڈھی ماں کو ترس آ ہی گیا۔ اس کو دروازہ کے پاس سے لاکر پلنگ پر بٹھا دیا۔ وہ بار بار ایک ہاتھ سے اپنے آنسو پوچھتی جاتی اور دوسرے سے پریما کا سر اپنے سینہ سے لگائے اس سے کہتی جاتی "چپ رہو بیٹی بھگوان کی مرضی" پریما کا باپ گھر پر موجود نہ تھا۔ اس کی بہن اور بھاوج نے اس کے پاس تک آنا گوارا نہ کیا۔ بڈھی ماں نے منھ ہاتھ دھلاکر جو کچھ دوپہر کا بچا کھچا رکھا تھا لاکر سامنے رکھ دیا۔ پریما کا باپ آیا تو اس نے دور ہی سے اس کی صورت دیکھ کر منھ پھیر لیا۔ اور بڑی نفرت سے کچھ بڑبڑاتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

رات کو جب سب سونے لیٹے تو ایک کونے میں پریما کا بھی پلنگ بچھا دیا گیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ چپ سادھے وہ خاموش پڑی رہی۔ رات زیادہ گئی تو ماں باپ میں باتیں ہونے لگیں۔

"بھاگ آئی وہاں سے" باپ نے پوچھا۔

"کیا معلوم" ماں نے جواب دیا۔

"کچھ بھی غیرت نہیں اسے۔ ناک کٹائی۔ منھ میں سیاہی لگائی۔ اب بھی پیچھا نہیں چھوڑتی"

ماں خاموش رہی

"سویرے ہی سارے گاؤں میں چرچا ہو جائے گا۔ ایک تو ایسے ہی کیا کم ذلیل ہیں۔ اور اگر معلوم ہو گیا کہ بلا کر رکھ لیا تو آنکھ اٹھانے کے بھی قابل نہ رہیں گے۔

یہ بھی نہ خیال آیا اس کو کہ اس کی وجہ سے چھوٹی بہن کی شادی پر کیا اثر پڑے گا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ اگر لالہ صاحب کو معلوم ہو گیا تو شادی کرنا تو درکنار وہ اپنے لڑکے کے اس طرف تھوکنے تک کے تو روادار ہوں گے نہیں۔"

"پھر کیا کیا جائے؟"

"سویرے ہی اسے چلتا کرو۔"

"اور اگر وہ نہ گئی؟ اور کہاں جائے گی؟"

"بڑی آئیں ہمدردی کرنے۔ جب بُرا کام کیا تھا تو تم سے پوچھ کر کیا تھا؟"

"اچھا کہہ دوں گی۔ سویرے چلی جائے گی۔"

"سویرے نہیں منھ اندھیرے۔" باپ نے جھلا کر کہا۔ "سارے گاؤں والوں نے دیکھ لیا تو پھر کیا رہا۔"

اتنے میں دوسری طرف سے آواز آئی۔ بھاوج کہہ رہی تھی۔ "یہ گھر تو رہنے کے قابل نہیں۔" چھوٹی بہن اور بھائی میں کھسر پھسر کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔ پریا کا دل دہل گیا کہ نہ معلوم کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ بار بار اپنے آپ سے پوچھتی۔ "کیا مجھے مار ڈالیں گے؟" وہ چاہتی تھی کہ اٹھ کر بھاگ جائے۔ لیکن اس کے ہاتھ پیر جواب دے چکے تھے۔

رات بھر وہ جاگتی رہی۔ منھ اندھیرے ذرا آنکھ لگ گئی۔ ماں نے پیر پکڑ کر جگا دیا وہ اُٹھ بیٹھی۔ ماں نے چپکے سے اس کے کان میں کہا۔ "بیٹی تو یہاں سے چلی جا۔ گاؤں والے تیری صورت دیکھ لیں گے تو ہم لوگوں کو کہیں کا بھی نہ رکھیں گے۔"

"اچھا۔" کہہ کر پریا نہایت ہمت سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے بڑی حسرت سے

چاروں طرف دیکھا اور جانے لگی۔ ایک قدم بڑھا کر وہ پھر رک گئی اس نے بہ مشکل سسکی ضبط کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا: "رامو کہاں ہے۔"

"ابھی جیل ہی میں ہے" ماں نے جواب دیا۔

"وہ آئے تو کہہ دینا کہ اُس کا لڑکا وہاں ہے۔" وہ ضبط نہ کرسکی۔ رو پڑی۔ منھ پھیر کر دروازہ کی طرف مڑی۔ ماں نے چپکے سے اس کے ہاتھ میں دو روپے دے دئیے۔ لیکن اس نے انھیں وہیں پھینک دیا۔ اور گھر سے نکل گئی۔

"وہ کہاں جائے؟" وہ بار بار اپنے سے پوچھتی اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر ایک طرف قدم اٹھائے چلی جاتی۔ رام ناتھ کے باغ کے پاس اس نے لاتا اور سندری کو دیکھا۔ وہ گھبرا سی گئی۔ یہ دونوں اس کی بہت ہی چہیتی سہیلیاں تھیں۔ لیکن ان لوگوں نے بھی اس کی طرف مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ان کی آنکھوں سے نفرت وحقارت اور ساتھ ہی ساتھ رحم ٹپک رہا تھا۔ ان کے سامنے سے وہ تیزی سے نکل گئی۔

وہ تھک کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کہاں جائے؟ اب وہ امید وبیم کے مدارج سے گزر چکی تھی۔ اور اُسے کامل سکون حاصل تھا۔ دفعتاً ایک خیال اُس کے دماغ میں بجلی کی طرح کوند گیا۔ ایک دفعہ سندری نے بتایا تھا کہ پاس ہی کے گاؤں سکرا میں ایک بہت خراب عورت رہتی ہے۔ وہ گاؤں کی خوبصورت لڑکیوں کو پھسلا کر انھیں شہر لے جاتی ہے اور وہاں رنڈیوں کے ہاتھ بیچ لیتی ہے۔ چند منٹ تک وہ بڑے فلسفیانہ انداز سے سوچتی رہی۔ پھر وہ ہمت کر کے کھڑی ہو گئی۔

"میں کہاں جاؤں؟"۔

"میں کہاں جاؤں؟" سنسان کھیتوں میں اس کی آواز پھیل گئی۔ وہی مذہب اور وہی سماج جو اس کو لعنت ملامت کرنے میں حد سے زیادہ تیز وطرار تھے اس وقت کہاں تھے جو اُسے بتاتے کہ وہ کہاں جائے۔ وہ سُگرا کی طرف چل کھڑی ہوئی!

شکست زہد

مولانا شرف الدین بڑے اللہ والے بزرگ تھے۔ قصبہ شہید پور کا ایک ایک بچہ اُن کے زہد و تقوی کا قائل تھا۔ گرد و نواح میں بڑی دور دور تک ان کی بزرگی اور روحانیت کا چرچا تھا۔ سویرے سے شام تک ان کے یہاں ضرورت والوں اور حاجت مندوں کا تانتا بندھا رہتا۔ مولانا صاحب کا اخلاق اتنا وسیع اور برتاؤ اتنا پاکیزہ تھا کہ ایک شخص بھی مایوس اور محروم نہ پلٹتا۔ عوام میں وہ شاہ صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔

حسن سیرت کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب حسن صورت سے بھی بہت زیادہ بہرہ مند تھے۔ سرخ و سفید گول کتابی چہرہ پر خوب کالی اور گھونگھر والی داڑھی بہت دیدہ زیب معلوم ہوتی۔ بلند و بالا ڈیل ڈول۔ کشادہ سینہ۔ لمبی ستواں ناک۔ بڑی بڑی نکیلی اور مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ اُبھرا ماتھا۔ ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی معطر زلفیں۔ جو دیکھتا دنگ رہ جاتا۔ ان کی شان و شوکت اور وجاہت پر لوگ رشک کرتے اور ان کی عزت و توقیر کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے

فقہ، حدیث اور دوسرے علوم دینی و مسائل شرعی میں شاہ صاحب کو مہارت تامہ

حاصل تھی۔ جب کبھی کسی مذہبی امر کے متعلق کچھ کہہ دیتے تو ان کا قول پتھر کی لکیر ہو جاتا پھر جاہے جتنی کتابیں الٹ ڈالی جائیں وہی بات فقہ میں ملتی۔ وہی حدیث میں اور وہی قرآن میں۔ ان کے فتاویٰ اور احکام دینی معلومات کے شاہکار ہوتے ان کو دیکھ کر بڑے بڑے عالم اور فاضل انگشت بدنداں رہ جاتے۔

شاہ صاحب کی عمر ابھی پینتیس چالیس بھی نہ تھی۔ لیکن عرصہ ہوا دنیا چھوڑ چکے تھے۔ کبھی بچپن میں بھی کسی لہو و لعب کے پاس نہیں کھڑے ہوئے۔ چھ سال کی عمر سے نماز پڑھتے اور سات سال کی عمر سے ان کا ایک روزہ بھی قضا نہ ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی ساری جوانی تحصیل علم اور تکمیل دین میں ختم کر دی تھی اور تزکیہ نفس کے ہر امتحان میں پورے اتر چکے تھے۔ تبلیغ و تلقین کے علاوہ شاہ صاحب کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ سویرے سے لے کر شام تک ہر وقت اپنے اعزا اور معتقدین کو تعلیم اور ہدایت کیا کرتے۔ خدا اور موت کو کبھی نہ بھولتے ان کی گفتگو کا کوئی ایسا موضوع نہ تھا جس میں یہ دونوں چیزیں گھوم پھر کر نہ آ جاتی ہوں۔

زہد کی خشکی اور تقوے کی سختی کے باوجود شاہ صاحب کچھ زندہ دل بھی واقع ہوئے تھے۔ اچھی خوراک اور اچھی غذا کے دلدادہ تھے۔ بات بات پر مسکراتے اور کبھی کبھار اپنے بے تکلف ہم عمروں اور دوستوں میں کچھ ہنسی مذاق بھی کر لیا کرتے۔ گاہے گاہے موقع محل دیکھ کر کسی پر کوئی فقرہ بھی کس دیتے۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب کی کوئی اور دلچسپی نہ تھی۔

یوں تو روپیہ پیسہ آل اولاد، شہرت عزت ہر معاملہ میں شاہ صاحب کی

خوش قسمتی ضرب المثل تھی لیکن بیوی کے معاملہ میں شاہ صاحب کچھ قسمت کے ہیٹے ہی واقع ہوئے تھے۔ کبھی کبھی یہی غم شاہ صاحب کے دل میں پھانس کی طرح کھٹکتا۔ دو بیویاں تابڑ توڑ داغ دے چکی تھیں۔ اور تیسری بیوی نہ صرف چہرہ مہرہ ہی میں ناپسندیدہ تھیں بلکہ ضرورت سے زیادہ زبان دراز بھی تھیں لیکن شاہ صاحب کا انیا اصابر شاکر انسان بھلا کب حرفِ شکایت زبان پر لاتا۔ جاننے والے جانتے لیکن شاہ صاحب خود بالکل خاموش تھے۔

شاہ صاحب عموماً زنان خانے میں بہت کم جاتے۔ ہر وقت باہر ہی رہتے۔ پہلی اور دوسری بیوی کے زمانہ میں شاید کسی اور وقت بھی جاتے ہوں۔ لیکن اب تو صرف دوپہر کا کھانا کھانے جاتے اور شام کو عشاء کے بعد۔

ایک روز دوپہر کو جیسے ہی انھوں نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا ان کو ایک بالکل نئی صورت نظر پڑی۔ شاہ صاحب پہلے تو کچھ ٹھٹکے۔ لیکن پھر اپنے زہد کے بل بوتے پر آگے بڑھ گئے۔ دل میں کچھ کھٹکا سا لگا لیکن انھوں نے بات ٹالنے ہی کی کوشش کی۔

کھانے کے بعد جب پان اور حقہ کا دور ختم ہوا تو شاہ صاحب حسبِ معمول باہر جانے لگے۔

بیوی نے کہا۔ "آج ایک نئی ماما آئی ہے"۔

شاہ صاحب بولے "کیا ایک اور ماما کے اضافہ کی ضرورت ہے؟"

بیوی۔ "ایک تو پہلے ہی سے کم تھی۔ اس موئے شہر میں تو کوئی گت کی ماما بھی نہیں ملتی"۔

شاہ صاحب، "پھر!"

بیوی۔ "تو میں نے اس نئی ماما کو رکھ لیا ہے۔"

شاہ صاحب کچھ کہے سنے بغیر بالکل غیر متعلق باہر چلے آئے۔ آج وہ خلاف معمول بہت خاموش تھے۔

دوسرے روز نئی ماما کو جس کا نام مونا تھا یہ خدمت سپرد ہوئی کہ وہ ہاتھ دھلائے۔ کھانا سجائے۔ اور پانی پلائے۔ شاہ صاحب اس کی طرف نظر اٹھا کے دیکھنا بھی اپنے تقدس کی توہین سمجھتے۔ لیکن بوقت ضرورت بیچارے کو نظر اٹھانا ہی پڑتی۔ مثلاً پانی پیتے وقت۔ تولیہ لیتے وقت۔ گرم روٹی مانگتے وقت یا خلال کرتے وقت۔

لاکھ شاہ صاحب شاہ صاحب تھے لیکن تھے تو آدمی ہی۔ کبھی کبھار کوئی فاسد وسوسہ ان میں بھی اٹھتا لیکن وہ اسے فوراً ہی نہایت بے رحمی سے کچل ڈالتے۔ جرأت گناہ تو شاید ان میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ ایک لمحہ کے لئے بھی باور نہ کر سکتے کہ کوئی شیطانی خیال ان کے دل و دماغ میں بھی گذر سکتا تھا۔ شیطان کے مقابلہ میں تو وہ اپنے کو ایک فولاد کی دیوار سمجھتے جو ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہو سکتی۔

شاہ صاحب کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب ایک روز ان کے بھانجے نے یوں ہی باتوں باتوں میں کہا۔ "آج کل آپ کچھ جلد ہی کھانا تناول فرما لیتے ہیں۔" شاہ صاحب ٹھٹھک کر رہ گئے۔ وہ اب تک بالکل لاعلم تھے کہ ادھر چند روز سے وہ جلد ہی کھانا کھا لیتے یا دیر میں۔ لیکن اس غیر متوقع اطلاع نے

شاہ صاحب کو بالکل ہی حیران اور پریشان کر دیا۔ کہنے لگے "کیا واقعی؟ جب کام سے فراغت پاتا ہوں کھا لیتا ہوں"! لیکن ابھی شاہ صاحب نے پوری بات ختم بھی نہ کی تھی کہ انھیں فوراً احساس ہو گیا کہ وہ بالکل غیر ارادی طور سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ کل وہ دو تین معتقدوں کو منتظر چھوڑ کر اندر چلے گئے تھے۔ لیکن بیچارے کیا کرتے اب تو جھوٹ منھ سے نکل ہی چکا تھا۔ چپ رہے اور دل میں بہت صدق سے توبہ کر لی۔

شاہ صاحب اچھی طرح سمجھتے کہ کھابنجہ نے جو کچھ کہا یوں ہی تذکرۃً کہا۔ اس میں کوئی مطلب یا معنی پوشیدہ نہ تھا۔ لیکن اس دن دوپہر بھر وہ اپنے آپ کو ملامت ہی کرتے رہے۔

اسی روز شام کو شاہ صاحب بہت دیر میں کھانا کھانے اندر گئے۔ اتنی دیر میں کہ گیارہ بھی بج چکے تھے۔ زنان خانے میں سناٹا پڑا تھا۔ بیوی بہت دیر ہوئی بہت کچھ بک بکا کر سو چکی تھیں۔ گھر بھر میں ایک مونا ہی بیدار تھی۔ اس نے بہت حسن و خوش اسلوبی سے اپنی تمام خدمات انجام دیں۔ لیکن شاہ صاحب کی دکھتی ہوئی رگ اور بھی زیادہ مجروح ہو گئی۔ اور ساری رات وہ اپنے بستر پر لوٹا ہی کئے۔

شاہ صاحب نے اپنی پارسائی کی فلک بوس عمارت بچیس تیس سال کی محنت شاقہ سے بنائی تھی۔ وہ سمجھتے کہ اس عمارت میں بیٹھ کر وہ ہمیشہ کے لئے دنیا کی تمام آلائشات سے پاک و صاف ہو گئے اور ان کا جسد خاکی ناری سے بالکل ہی نوری ہو گیا۔ لیکن اب جو انھوں نے دیکھا کہ ذرا سے جھٹکے میں یہ عمارت متزلزل ہو گئی اور ان کے نور میں بھی نار کی ایک گستاخ چنگاری سلگ رہی ہو۔ تو ان کے احساس،

غیرت اور خودداری کو بہت زبردست ٹھیس لگی اور وہ بدحواس ہو گئے۔ ان کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔

آٹھ دس روز کے اندر پے در پے شاہ صاحب کو کچھ ایسے حوادث پیش آئے کہ انھیں یقین کامل ہو گیا کہ شیطان بشکل مونا ان کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ اور انھیں بڑا زبردست مقابلہ کرنا ہے۔ یوں تو یہ حوادث محض حوادث ہی تھے۔ لیکن شاہ صاحب کے لئے ان کی بہت ہی زیادہ اہمیت تھی۔ وہ حوادث کچھ اسی قسم کے تھے کہ ایک روز شام کو اندھیرے میں شاہ صاحب کا ہاتھ مونا کے پیٹ پر پڑ گیا۔ شاہ صاحب باہر سے اندر آ رہے تھے اور وہ اندر سے باہر جا رہی تھی۔ اور بروٹھے میں بالکل ہی اندھیرا گھپ تھا۔ ایک روز پانی پلاتے وقت مونا کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ پڑا۔ دو تین روز شام کو شاہ صاحب باہر معتقدین سے اتنی دیر تک گفتگو کرتے رہے کہ جب وہ زنانخانے پہونچے تو سوائے مونا کے دوسرے سب لوگ غافل ہو چکے تھے۔ شاہ صاحب کی بیوی پر یکایک میعادی بخار کا بہت مہلک حملہ ہوا۔ اور ان کی زندگی کے لالے پڑ گئے۔

روز بروز شاہ صاحب کی مشکلات میں اضافہ ہی ہوتا جاتا۔ اب وہ ہر نماز کے بعد سب سے پہلے نہایت خشوع و خضوع سے یہی دعا مانگتے کہ "اے مالک مجھ پر بڑا صبر آزما امتحان آ پڑا ہے۔ تجھ ہی پر بھروسہ ہے۔ تو ہی میرے ایمان کو بچائیو۔ اور مجھے خیال فاسد اور وسوسۂ باطل سے محفوظ رکھیو" دو ہفتہ بعد اچانک شاہ صاحب کی تیسری بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ بیوی لاکھ بری تھیں لیکن پھر بھی بیوی ہی تھیں۔ شاہ صاحب کو ان کی دائمی مفارقت کا بہت قلق ہوا۔ اور انھوں نے اس قلق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے زہد کو بھی جلا دینا چاہا۔ اور تہیہ کر لیا کہ اب حتی المقدور کوئی

نئی شادی نہ کریں گے۔ اور اس خیال سے کہ مبادا کہیں ان کے قدم ڈگمگا جائیں انھوں نے زنان خانے میں آنا جانا ہی ترک کر دیا۔

دو ہفتہ تک شاہ صاحب نہایت پامردی سے اپنے ارادہ پر قائم رہے۔ لیکن یہ دو ہفتے انھیں دو سال سے بھی زیادہ گراں معلوم ہوتے۔ بالآخر کشمکش کا دور ختم ہوا اور شاہ صاحب نے سوچا کہ آخر زنانخانے جانے میں کیا ہرج ہے۔ اگر مونا مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے تو اس میں میرا کیا قصور اور پھر اس میں نقصان ہی کیا ہے۔ میری پارسائی کوئی موم تو ہے نہیں کہ مونا کی شعاع حسن پڑتے ہی پگھل جائے۔ مجھے جب اپنے ایمان پر کامل اعتماد ہے تو پھر آخر امتحان سے بھاگنے کے کیا معنی؟ شاہ صاحب از سر نو زنانخانے جانے لگے اور شب میں وہیں استراحت فرماتے۔

ایک رات سوتے سوتے شاہ صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ طبیعت بہت پریشان تھی حلق خشک تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ اور وہ اپنے گرد غضب کی تنہائی محسوس کرتے۔ اٹھکر پانی پیا، چند آیتیں دم کیں۔ اور ٹہلنے لگے۔ لیکن بے چینی کم نہ ہوئی۔ یک بیک شاہ صاحب کے قدم ایک خاص سمت بڑھنے لگے۔ انھوں نے زینہ کھولا اور نیچے اتر گئے۔ "مجھے شکست قبول ہے" وہ منھ ہی منھ میں بڑبڑائے اور باورچی خانے کے قریب والے کمرہ کے دروازہ پر پہونچگئے۔ اندر سے کچھ آہٹ معلوم ہوئی شاہ صاحب اپنی جگہ ہی پر ٹھٹھک گئے۔ پھر کچھ ہمت کی اور دراز سے جھانکنے لگے۔ اندر مدہم لالٹین جل رہی تھی۔ اور اس کی روشنی میں مونا اور شاہ صاحب کے بڑے لڑکے مشرف کے چہرے چمک رہے تھے۔

شاہ صاحب اُلٹے پیروں اپنے کوٹھے پر واپس چلے گئے۔ سویرے نہ انھوں نے مشرف کو عاق کیا اور نہ مونا کو موقوف۔

ریل

ریل چلتی رہتی ہے اور زندگی گذرتی رہتی ہے!

ریل چلتی رہے گی اور زندگی گذرتی رہے گی!

لیکن کبھی ریل چلتے چلتے اُلٹ بھی جاتی ہے!

کیا کبھی زندگی بھی گذرتے گذرتے اُلٹ جائے گی۔؟ اور نیچے کی چیزیں اوپر ہوجائیں گی؟ کسے خبر؟ کیا معلوم؟

لیکن اس قسم کی حماقت خیز باتوں سے فائدہ کیا؟۔ ریل کی ٹکریں تو شائد آپ نے کبھی دیکھی ہوں۔ لیکن کیا آپ نے کبھی زندگی کی ٹکریں بھی ملاحظہ فرمائی ہیں ــــــــ محسوس کی ہیں؟ لیکن پھر وہی جیل جانے کی باتیں! زندگی کو چھوڑیے اور زندہ رہنے والوں کو گولی ماریئے اور پان کھا کھا کر اور سگریٹ پی پی کر بنگال کے قحط زدہ انسانوں کے افسانے اخبارات میں پڑھیے۔ موسم کی خرابی کی شکایت کیجیے۔ اپنے ہمسایہ کی بیوی سے عشق لڑائیے۔ اور جی ہاں ریل کی باتیں کیجیے! میں شاید اس سے قبل یہی عرض کر رہا تھا!

ریل اور زندگی میں ایک بنیادی تعلق ہے اور وہ یہ کہ دونوں ہی لڑتی اور

لڑائی چلتی ہیں اور نتیجہ کی صورت میں کچھ حضرات کو جبر اور بہت سے بیچاروں کو صبر کرنا پڑتا ہے ——— لیکن تصوّف کی اس پیچیدہ اور طولانی بحث کو کسی سہالک کے موقع کے لئے اٹھا رکھئے! ——— ریل لڑتی بھی ہے اور لڑاتی بھی ہے۔ لڑتی اس وقت ہے جب دو انجن آپس میں دو لیڈروں کی طرح ٹکر کھا جاتے ہیں اور فرقہ وارانہ فساد کا نقشہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ اور لڑاتی اس وقت ہے جب کوئی کھڑا مسافر کسی آرام سے لیٹے ہوئے مہمان کا پیر ہلا دیتا ہے اور طبقہ وارانہ جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو آگ اور پانی کے اس کھیل کا اصل کام نہ لڑنا ہو نہ لڑانا۔ بلکہ ہندوستان ایسے ملک میں جہاں انسانوں کے بجائے ہندو اور مسلمان بستے ہیں ان دونوں اقسام کے جانداروں میں دوستی اور محبت پیدا کرانا ہے کسی پُرفضا اور خواب آور رات کو آپ نے ضرور کسی ایسے ڈبہ میں جس میں کہ "۱۲ بیٹھنے کی جگہ" لکھا ہو اور چھتیس مسافر لیٹے ہوں یا لیٹنے کی کوشش کر رہے ہوں یا اپنے آپکو لیٹنے کی غلط فہمی میں مبتلا کر رہے ہوں۔ دیکھا ہو گا کہ کسی مارواڑی بنئے کی توند کسی پشاوری پٹھان کے قدموں پر پڑی ہے اور کسی بنگالی مہ جبین کی زلفیں کسی فرنگی محل کے مولانا کی داڑھی سے دست بہ گریباں ہیں اور کفر اور اسلام کی اس والہانہ ہم آغوشی پر مسرور اور شاداں ریل کسی الھڑ حسینہ کی طرح میدانوں کہساروں اور جنگلوں میں بل کھاتی، اٹھلاتی، ناچتی، گاتی، اور شور مچاتی چلی جا رہی ہے۔ "ہندو مسلم بھائی بھائی۔ ہندو مسلم بھائی بھائی!"

میں تھا اور مولانا نور عالم مع اپنی داڑھی۔ عینک اور ایک عدد لوٹے کے دو بستر مزید برآں تھے اور دہلی سے سندیلہ تک کا دسمبر ۱۹۴۱ء میں رات کو تھرڈ کلاس کا

سفر ! ع جمع تھیں آفتیں خدائی کی ! گاڑی ۱۶ بجکر ۵۰ منٹ پر چھوٹتی - اور ہم ۱۵ بجکر ۳۵ منٹ پر پلیٹ فارم پر پہونچ چکے تھے ۔ ٹکٹ گھر کے سامنے ایک طوفان بے پایاں موجیں مار رہا تھا ۔ آدمیوں کی ایک یلغار تھی جو امنڈ رہی تھی اور کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب مسافر مل کر ٹکٹ گھر کی عمارت کو پیچھے ڈھکیل رہے ہیں ۔ بیس پچیس فٹ جگہ میں تقریباً پانچ سو آدمی دھکے دے رہے تھے ۔ زور لگا رہے تھے ، ہانپ رہے تھے اور چیخ رہے تھے ۔ اور بعض خدا کے بندے اس ہنگامہ میں بھی تھوک رہے تھے ۔ ناک صاف کر رہے تھے ۔ بیڑیاں پی رہے تھے ۔ اور دیگر اقسام کی ضروریات زندگی سے بھی فارغ ہو رہے تھے ۔ پسلیاں چٹخ رہی تھیں ، پیر کچل رہے تھے ، کندھے چھل رہے تھے ۔ کہنیاں چبھ رہی تھیں ۔ کپڑے پھٹ رہے تھے ۔ دم گھٹنے کے باعث ایک عالم نزع سا طاری تھا لیکن کسی کو کچھ خبر نہ تھی ۔ ٹکٹ حاصل کرنے کا ایک اندھا جوش اور کھڑکی تک پہونچ جانے کی ایک حیوانی ضد تھی ۔ اور ہر شخص اسی میں مبتلا بلکہ غرق تھا ۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ ہمارے ہندستانی بھائی بھی کسی ایک کام کے کرنے میں اس قدر منہمک ، مستغرق اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو سکتے ہیں ۔ اس ہنگامہ رستخیز میں جو بیچارہ مر کھپ کر کھڑکی تک پہونچ بھی جاتا تو پھر اس کی واپسی غیر ممکن ہو جاتی ۔ بعض لوگ تو دوسروں کے سروں اور کاندھوں سے واپس آئے اور بعض غریب راستہ ہی میں مار کھا کر رہ گئے ۔ البتہ ایک صاحب نے کمال ہی کر دیا کہ وہ ٹکٹ لیکر دوسروں کی ٹانگوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے ٹھوکریں کھاتے اور لنگڑاتے ہوئے مجمع سے مثل ایک فٹ بال کے نمودار ہوئے ۔ مولانا نور عالم صاحب نے اس جملہ ہنگامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ” اگر تمام

ہندستانی اسی یک جہتی سے سوراج حاصل کرنے کی کوشش کر بیٹھیں تو بس"

میں نے عرض کیا۔ "آپ مطمئن رہیں۔ بحمداللہ اس طور سے کوشش ہو بھی رہی ہے۔ مقصد ہر شخص کا ایک ہے لیکن ہر ایک دوسروں کو تفریحاً کہنیاں مار رہا ہے اور اس کے کپڑے پھاڑ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

مولانا صاحب گھبرا کر بول اُٹھے "مطلب!"

"مطلب یہ کہ آپ ریل میں بیٹھنا چاہتے ہیں یا جیل تشریف لے جانا چاہتے ہیں۔"

ایک آہ سرد بھر کر مولانا نورعالم کہنے لگے "ریل جب میسر نہیں، تو پھر جیل جانے میں کیا مضائقہ ہو سکتا ہے؟"

ایک صاحب جو پاس ہی کھڑے ہوئے تھے نہایت بدتہذیبی سے مخل ہوگئے۔ "میں ایسی ترکیب بتا سکتا ہوں کہ آپ ریل میں بھی بیٹھیں اور جیل بھی جائیں۔"

مولانا نے ایک خشمگیں نظر سے ان کو دیکھا۔ "آپ اپنا نسخہ جیب ہی میں رکھیں گرہ کٹوں کے متعلق گورنمنٹ نے پیشتر ہی سے ہدائتیں مشتہر کرادی ہیں!"

جملہ معترضہ فرمانے والے بزرگ اپنی جیبیں ٹٹولتے ہوئے ہم لوگوں سے دور نکل گئے۔ اور ہم لوگ پھر ہنگامہ کا صرف ایک جزو بن کر رہ گئے۔

________ ہجوم کی یورش ہر لحظہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اور بہت جلد ہم لوگوں کا ایمان ہوگیا کہ ٹکٹ حاصل کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ وائسرائے یا کمانڈر انچیف کی ٹوپی اُچک لینا۔ بدرجہ مجبوری ہم لوگ بلا ٹکٹ سفر کرنے کے نتائج پر غور کرنے لگے اور ابھی نیتوں میں تھوڑا ہی سا فتور آیا تھا کہ دفعتاً ایک ہم وطن

ٹکٹ چیکر صاحب چائے پیتے نظر پڑ گئے۔ قصہ کوتاہ ہم لوگوں نے ان کی چائے اور ناشتہ کے دام ادا کئے، اور اس شریف آدمی نے ہم لوگوں کی کس مپرسی پر رحم کھایا اور نہیں معلوم کس چور دروازہ سے دفتر میں گھس کر ہم لوگوں کے لئے ٹکٹ لے آیا۔ اس ہتھیار سے مسلح ہو کر ہم لوگ اپنی گاڑی کی طرف پلیٹ فارم نمبر ۲ کو کشاں کشاں چل پڑے ہم لوگوں کے ساتھ ہی ساتھ مارواڑی عورتوں کا ایک قافلہ بھی روانہ ہوا تھا اور مولانا نورعالم صاحب چودھویں صدی سے اس قدر خائف نظر آتے کہ احتیاطاً اپنے قلی کا ہاتھ بھی پکڑے ہوئے تھے اور استغفراللہ کا ورد بھی کرتے جاتے۔

پلیٹ فارم پر پہونچنے سے قبل ہی ہم لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ٹکٹ گھر کے پاس ابھی جو منظر دیکھ آئے ہیں وہ محض ابتدائے عشق تھا۔ گاڑی آچکی تھی اور گاڑی کے ساتھ شاید قیامت بھی آچکی تھی۔ پلیٹ فارم پر جو ہجوم تھا اس کا بیان کرنا ایک بیکار سی بات معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس کا صحیح اندازہ صرف اپنی آنکھ سے خود مشاہدہ کرنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور آپ اس زمانہ میں ضرور ہی اس قسم کا مشاہدہ کر چکے ہوں گے۔ گاڑی کا ہر ڈبہ ٹکٹ گھر بنا ہوا تھا۔ اور ہم کو اگر تعجب تھا تو صرف یہ کہ آخر اس بے پناہ دھینگا مشتی سے گاڑی الٹ کیوں نہیں جاتی اور اپنی جگہ پر قائم کیسے ہے۔

انجن سے لے کر گارڈ کے ڈبہ تک۔ گارڈ کے ڈبہ سے لے کر انجن تک ہم نے اور مولانا نورعالم صاحب نے چار گشت کئے۔ اور سینکڑوں دھکے اور ہزاروں کہنیاں کھائیں۔ لیکن سوائے گاڑی کی چھت کے اور کہیں جگہ نظر نہ آئی

البتہ تین چار ڈبوں میں رنگروٹ بیٹھے تھے اور ان ڈبوں میں البتہ آدھے سے زیادہ جگہ خالی تھی۔ لیکن کوئی مسافر ان کی طرف جانے کا رخ بھی نہیں کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ ریلوے کے ملازمین بھی اس طرف قدم بڑھانے سے کنائی کاٹتے تھے۔ کوئی مسافر ان ڈبوں کی طرف حسرت سے دیکھ بھی لیتا تو رنگروٹ بندروں کی طرح خوخیا دوڑتے۔

انجن نے آخری سیٹی دی اور ہم لوگوں کے پیر غیر ارادی طور سے اور زیادہ تیزی سے چلنے لگے۔ لیکن کس طرف اور کس ڈبے کے لئے۔ یہ ہمیں خود معلوم نہیں تھا۔ ـــــ گاڑی اب آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی ـــــ مولٰنا نے بے اختیار ایک جاں باز مجاہد کی طرح ایک ڈبہ پر حملہ کیا۔ ہینڈل گھما کر دروازہ کے اندر ان کا گھسنا تھا کہ پیچھے سے میں نے جست کی اور ان کو اندر ڈھکیل مارا۔ قلی نے ایک کھڑکی سے اسباب ادھا دھند جھونک کر پیشگی مزدوری وصول کرنے کا پورا حق ادا کر دیا۔ یہ سارا واقعہ اس سرعت سے پیش آیا جیسے کوئی بجلی چمک گئی ہو۔

"حرام زادہ۔ اندھا ہے۔ سور کا بچہ۔ تیری ...." وغیرہ وغیرہ فوجیوں کے ایک گروہ سے گالیوں کی بوچھار چلی۔ ایک تیز دم رنگروٹ نے جو شاید دروازہ کی حفاظت ہی کے لئے اس کے پاس بیٹھا تھا اور ہم لوگوں کے دفعتاً گھس آنے پر ہم لوگوں سے بھی زیادہ بدحواس تھا لپک کر مولانا نور عالم پر گھونسہ کا وار کیا۔ عین اس وقت مولانا کے وضو کا لوٹا جو مثل ان کی داڑھی کے ان کا جزو بدن تھا بڑا کام آگیا۔ بھرپور گھونسہ کو اس نے اپنی ٹوٹی پر روک لیا۔ اور بیچارے رنگروٹ کا تو وضو ہی شکست کر دیا۔ دھکے کے زور سے مولانا سیٹ پر گر پڑے اور ڈبہ کے اندر ان کی جگہ بہت مستحکم ہو گئی۔ اور نہیں معلوم کیسے میں نے

اپنے آپ کو ان کے اوپر سجدہ کرتے ہوئے پایا۔ فوجی بدمذاق ضرور تھے۔ لیکن اس وقت انگیز منظر سے وہ بھی متاثر ہوئے۔ ہر چہار جانب سے قہقہے بلند ہوئے۔ زخمی رنگروٹ شرمندہ ہو چکا تھا لیکن اس نے اپنی وردی کی لاج رکھنے کی خاطر اپنے خون نکلتے ہوئے ہاتھ سے مولانا کا لوٹا چھین کر کھڑکی کے باہر کسی کبوتر کی طرح اڑا دیا۔ قریب تھا کہ اس کے فوجی جوتے کی بے پناہ ٹھوکر سے یہ راقم السطور قید حیات اور بند غم دونوں سے نجات پا جاتا کہ کسی بھلے مانس رنگروٹ نے ہمارے جان لیوا رنگروٹ کو جھپٹ کر روک لیا۔

"جانے بھی دے سالے۔ اب آ گئے ہیں یہ اُلو کے پٹھے تو کیا جان سے مار ڈالے گا ان کو؟"

فوجی قہقہوں اور گالیوں کے درمیان میں اور مولانا ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ "پورے درندے ہی ہوتے ہیں یہ اخوان الشیاطین" مولانا نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ان کا منہ سرخ تھا اور سارے جسم میں رعشہ پڑ گیا تھا۔

"آپ کا وضو کا لوٹا شاید آپ کو عاقبت میں نہ بخشوائے لیکن اس وقت تو اس نے بخشوا ہی لیا۔ داغ مفارقت بھی تو دے گیا غریب!" میں نے کہا اور سمجھا کہ شاید اس سے مولانا کا کچھ غم غلط ہو جائے۔ لیکن وہ اس وقت اس قسم کے طفلانہ تمسخر کے روادار نہیں تھے۔ "چپ، خاموش، خبردار!" انھوں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے ایک فوجی کو مخاطب کیا۔

"کیوں صاحب۔ کون اتنا بڑا گناہ کیا تھا میں نے جو جگہ نہ ملنے پر آپ کے ڈبہ میں گھس آیا ــــ شائستگی اور تہذیب بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔ فوج میں

ملازم ہونے سے پیشتر آپ بھی تو میری طرح انسان ہی رہے ہوں گے ——— ہمارا اور آپ کا وطن ایک ——— یہ میری ضعیفی دیکھئے ———" مولانا ایک طول وطویل وعظ دینا چاہتے۔ لیکن اپنی وحشیانہ حرکتوں سے فوجی اس کے سننے کے روادار نہ ہوئے۔ ایک نے نہایت گستاخانہ انداز میں مولانا کی لال واسکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئی تان لگائی " انگیانہ پہنو جانی لال ٹول کی!"

" استغفراللہ!" مولانا نے چیخ کر کہا اور مجبوراً خاموش ہو گئے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد مولانا اور ایک فوجی سے کچھ گرما گرم مباحثہ بھی ہوا۔ اور قریب تھا کہ مولانا کو پھر کوئی سانحہ پیش آئے کہ میں نے اُن سے جل کر کہا " یہ لفظی جدال وقتال ہی مولانا دنیٰ کو عقبیٰ میں جہنم لے جاتا ہے اور اس دنیا میں ریل کے ڈبّہ سے نکلواتا ہے"! مولانا میری طرف بہت خشمگیں نظروں سے دیکھ کر خاموش ہو گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اور ہم لوگوں پر کوئی مزید گالی یا مار نہیں پڑی اور ہم لوگوں نے پھول اور پھیل کر سیٹ پر اپنے لیے کافی جگہ بنالی۔

ریل چلتی رہی، چلتی رہی، برابر چلتی رہی حتیٰ کہ تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگوں کو بھی اپنا ماحول قابل برداشت محسوس ہونے لگا ——— اور شائد آپ کو تعجب ہو میرے اس پاگل پن پر کہ چند اسٹیشنوں کے بعد جہاں کہ یہ بہت شور اور ہنگامے مچاتے مجھے ان رنگروٹ فوجیوں پر رحم آنے لگا۔ حضرت عیسیٰ نے فرمایا ہو کہ " وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں" ہمارے ہم سفر فوجی اس مقولہ کی زندہ تفسیر تھے۔

ہماری ہی طرح ہمارے ڈبّہ میں سات فوجی ابھی زندگی کے دن پورے

کر رہے تھے۔ ان میں تین تو مسن تھے اور بیوی بچوں والے معلوم ہوتے۔ لیکن چار بقول مولانا "بالکل ہی لونڈے تھے" ذہنی حیثیت سے بیچارے ساتوں قابل رحم تھے۔ ان کی آپس کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ اپنی بریلی کی چھاونی کو واپس جارہے ہیں۔ ان کی واپسی بالکل ہی بادل ناخواستہ تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے بھگوڑے لڑکے واپس اسکول جاتے ہیں۔ ایک فوجی اوپر والی سیٹ پر لیٹا نہیں معلوم کیا کر رہا تھا۔ بہت خاموش تھا بیچارہ۔ کبھی چت لیٹ کر چھت کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور کبھی دائیں کروٹ ہو جاتا اور کبھی بائیں۔ کبھی جماہی لیتا اور کبھی سگریٹ پیتا لیکن اُسے کسی کل چین نہیں تھا۔ ایک آدھ دفعہ شبہ ہوا کہ اس نے ٹھنڈا سانس بھی لیا مجھ پر اور مولانا پر جو کچھ زبردستی ہوئی تھی اُس میں وہ بالکل غیر جانبدار رہا تھا۔ بلکہ اس کی نگاہوں سے تو یہ معلوم ہوتا کہ وہ ہمارا ہمدرد ہی۔ ایک دفعہ اُس نے اپنی تکیہ سرکا دی تو اُس کے اندر سے ایک کتاب نکل کر گر پڑی۔ اس کتاب میں دور ہی سے پتہ چلتا کہ عورتوں کی برہنہ تصویریں بنی ہوئی ہیں۔

دوسرا فوجی جو صورت سے بے وقوف معلوم ہوتا ایک کونے میں بیٹھا چیخ چیخ کر رامائن پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے جوش میں آکر ہاتھ پیر بھی ہلانے لگتا۔ کبھی کبھی اپنی عینک کے نیچے یا اوپر سے ہم لوگوں کو بھی گھور لیتا اور معلوم ہوتا کہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کی مشخص آواز سے ہم لوگ کس قدر متاثر ہو رہے ہیں۔ اس کا سر خوب گھٹا ہوا تھا اور دو تین اسٹیشنوں پر اس نے ایک آدھ اندر آنے والے مسافروں کو خوب گالیاں دی تھیں۔ مولانا نور عالم کی داڑھی پر اس کی جو ابھتی ہوئی نظریں پڑتیں وہ تحفظ ہندستان کے آرڈیننس کے بموجب ضرور قابل دست اندازی

تھیں۔

تیسرا فوجی اگرچہ زمانے کے ہاتھوں پریشان نظر آتا لیکن خوش مذاق تھا۔ اسی اللہ کے بندے نے اپنے خونخوار بھائی سے ہماری جان بچائی تھی۔ وہ کبھی لیٹ جاتا کبھی اپنے پیر کے ناخن کاٹنے لگتا کبھی آپ ہی آپ گانے لگتا۔ اور خوب حلق پھاڑتا۔ کبھی اپنے نوعمر ساتھیوں پر فقرے کہتا۔ کھانے کا بڑا شوقین تھا۔ اور کوئی اسٹیشن ایسا نہیں گزرتا جس پر اس نے کچھ خرید کر کھا نہ لیا ہو۔ عورتوں کو گھورنے کا اسے مستقل مرض تھا۔ کبھی کبھی ان کو آنکھ بھی مارتا۔ اور "ہائے جان" "چاقو مارو" وغیرہ چیختا۔ تھا لفنگا لیکن دل کا برا نہیں تھا۔

بقیہ چار فوجی بالکل ہی بندر صفت تھے ان کی حرکات و سکنات کو تسلسل سے بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک دوسرے کی پگڑی باندھتا اور تیسرا اسے نوچ لیتا۔ ان کے فوجی کپڑوں کے باوجود گنوارپن ان سے پھوٹا نکلتا۔ ہر چیز کو حتی کہ اپنے کپڑوں کو وہ غیر معمولی تعجب سے دیکھتے۔ اسٹیشنوں پر گاڑی رکتی تو وہ منہ کھول کر پلیٹ فارم پر کھڑے ہو جاتے اور بچوں کی طرح اپنے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتے۔ آپس میں بھی باتیں کرتے تو ایک دوسرے کو گالیاں دے کر مخاطب کرتے۔ ان اجڈ رنگروٹوں کو اپنی طاقت اور حکومت جتانے کا بڑا شوق تھا جس پر بسا اوقات رحم بھی آجاتا۔ جب وہ اپنے فوجی غرہ میں کسی پر رعب جماتے یا اپنی حکمرانی کی ادائیں دکھانے کی کوشش کرتے تو صدیوں کی غلامی اور محکومیت ان کے چہروں پر ماتم کرتی ہوئی نظر آتی۔ اپنے نیکر اور کوٹ کے بل بوتے پر یہ احمق اپنے آپ کو ہندستانی کہلانا بھی باعث

ننگ سمجھتے۔ کچالو والے سے مٹر خریدتے تو سینہ تان کر گرجتے۔ "ہم مٹر مانگتا ہی۔ کتنا پیسہ ہوا۔ تم گدھا موافق بات کرتا ہی۔"

مراد آباد کے اسٹیشن پر ان رنگروٹوں نے نہیں معلوم کس بات پر ایک پان بیچنے والے لڑکے کے دو چار ہاتھ مار دیئے اور اس سے سگرٹ کی کئی ڈبیاں چھین لیں۔ پان والے نے بڑا شور وغل کیا اور اس کے گرد ایک مجمع بھی جمع ہو گیا۔ لیکن کسی نے ان لیڈروں سے کوئی بازپرس نہیں کی۔ دو کانسٹبل مجمع کو ڈھکیلتے اور گالیاں دیتے ہوئے آگے بڑھے لیکن فوجیوں کو دیکھ کر ان کے جوش اور غصہ کی کوک نکل گئی۔ اور اپنی ناک سکوڑتے ہوئے وہ دوسری طرف مڑ گئے۔ مجمع نے پولیس کی اس کس مپرسی پر اظہار مسرت کیا۔ دو ایک حسن شاندی فوجیوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔ "بھلا ان کے مقابلہ پر کون بول سکتا ہی ان کی تو بات ہی دوسری ہی" ——————— اسی خلفشار میں۔ ایک بڑی دل دوز 'آہ' کے ساتھ گاڑی چل پڑی۔

دو بج چکے تھے جب گاڑی بریلی پہونچی۔ چھ فوجی اتر گئے لیکن اوپر لیٹا ہوا فوجی کروٹیں ہی بدلتا رہا۔ اسے شاید آگے جانا تھا۔ آٹھ دس نئے مسافر ڈبہ میں گھس آئے اور اس کا ماحول بدل گیا۔ رات کا وقت تھا ہر ایک مسافر ادھر ادھر کونے میں دبک گیا۔ دو مارواڑی بنئے اوپر لیٹے ہوئے فوجی کی بنچ کے نیچے بیٹھ گئے اور زور زور روئی کا بھاؤ سٹہ کرنے لگے۔ پہلے تو دوستانہ حساب ہوتا رہا لیکن پھر معاندانہ انداز پیدا ہوا۔

دو چار دفعہ ایک نے دوسرے کی بات پلٹائی۔ پھر دونوں چیخنے لگے۔

گویا لڑائی لڑ رہے ہوں۔

ایک کہتا "نو سو بہتر دو آنہ نو پائی"۔

دوسرا کہتا۔ "نو سو اکھتر تیرہ آنہ تین پائی"

اوپر لیٹے ہوئے فوجی نے سر نکال کر کہا۔ "کیا بک بک لگائی ہو" لیکن بنیے قابو میں نہیں آئے۔ انھوں نے باری باری پھر اپنا وظیفہ گردانا۔ درجہ کے دوسرے مسافر انھیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

فوجی نے جب بیشتر سر نکالا تھا تو بنیے شاید دیکھ نہ پائے تھے کہ وہ کون ہو اس دفعہ اس نے اپنا فوجی ٹوپ اوڑھ کر اور روشنی کے بالکل سامنے جھکتے ہوئے فوجی لہجہ میں کہا "خاموش بیٹھو! کیا حلق پھاڑ پھاڑ کر سب کی نیند حرام کر رہے ہو" فوجی کے ٹوپ کو دیکھنا تھا کہ بنیوں کو سانپ سونگھ گیا۔ اپنے کمبلوں میں منھ چھپا کر اس طرح بیٹھے کہ پھر سفر بھر ہم لوگ ان کی صورت دیکھنے کو ترس گئے۔

مولانا بیشتر ہی سے خراٹے بھر رہے تھے۔ اور ان کی بے نیازی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ ان کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ ان کے ہاتھ پیر اور سر پوری بنچ پر عجیب انتشار سے بکھرے ہوئے تھے۔ اور ان کا تلاش کرنا بھی مشکل تھا۔ نہیں معلوم کس اسٹیشن کے قریب میں بھی اونگھ گیا۔ ریل بڑی مستانہ چال سے گنگناتی ہوئی بہتی چلی جا رہی تھی۔ اور معلوم ہوتا کہ اپنے ساتھ ساری دنیا کو گھسیٹے لئے جا رہی ہو۔

ایک دفعہ میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک صاحب لحاف میں اپنا منھ لپیٹے اپنی بیوی کو صاحبزادے کا پاخانہ صاف کرنے کی ہدایتیں کر رہے تھے

وہ بیچاری ایک ہاتھ سے صاحبزادے کو لٹکائے اور دوسرے سے کسی کپڑے کو پکڑے پاخانہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بدتمیز لڑکا بُری طرح چیخ رہا تھا۔ —— عین پاخانہ کے سامنے ایک صاحب ڈھیر تھے —— پھر کیا ہوا مجھے خبر نہیں۔ البتہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک عورت کی گردن پر اس کا شوہر ہے اور شوہر کی گردن پر ہاڑ داڑھی بنئے اور ان کی گردن پر کانسٹبل اور کانسٹبل کی گردن پر فوجی رنگروٹ اور اُن کے منھ کے سامنے ایک روٹی لٹک رہی ہے —— اور میری گردن پر مولانا نور عالم —— میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ واقعی مولانا نور عالم میری گردن ہی پر تھے۔ شاہجہاں پور گذر چکا تھا اور اب اسٹیشن جلد جلد آرہے تھے۔ ہر اسٹیشن پر مسافروں کی ایک نئی کھیپ اندر آجاتی رفتہ رفتہ درجہ میں جائے تنگ و مردمان بسیار کا مضمون ہوگیا۔ ہردوئی کے اسٹیشن پر ناقابل برداشت بھیڑ ہوگئی گاڑی چھوٹنے ہی والی تھی کہ ایک دھوتی بند جن کی تھوڑی سی شناسائی مجھ سے بھی تھی اور جن کو جگدیش کہتے۔ مجمع کو چیرتے پھاڑتے دو عورتوں کو اندر ڈھکیلتے ہوئے درجہ میں داخل ہوئے۔ ایک عورت تو سن رسیدہ تھی لیکن دوسری بالکل ہی الھڑ نوجوان جس کی شکل سے اٹھارہ اُنیس سال کی عمر ہوگی۔ حسین تو خیر وہ نہیں کہی جا سکتی البتہ صحت اور جوانی کا غرور ایک مرقع تھی۔ دونوں عورتیں نہایت ہی میلی کچیلی تھیں اور ان کے جسم کے چیتھڑوں سے گھن معلوم ہوتی۔ پھٹے پرانے کپڑوں سے نوجوان لڑکی کا صندلی بدن پھوٹا نکلتا۔ اور وہ بیچاری مشکل سے اس کو چھپا پاتی۔ جگدیش تو میرے بستر پر آکر بیٹھ گیا لیکن دونوں عورتیں دروازہ کے پاس فرش ہی پر بیٹھ گئیں۔ مجمع کی بہت سی نظریں لڑکی کی طرف

متوجہ ہوگئیں۔ اور اس کے پھٹے کپڑوں میں اُلجھ گئیں۔

جگدیش نے مجھے مخاطب کرکے لیکن اس آواز سے کہ ڈبہ کا ہر مسافر سُن لے کہا: "یہ ماں اور بیٹی بریلی کی رہنے والی ہیں۔ پرسوں یہ بغیر ٹکٹ اپنے گھر سے روانہ ہوئیں لیکن شاہجہاں پور میں اُتار دی گئیں۔ کل یہ پھر شاہجہاں پور سے چلیں اور رات کو ہردوئی میں اتار دی گئیں۔ اب اس وقت یہ ہردوئی سے سوار ہوئی ہیں شاید آج ضرور لکھنؤ پہونچ جائیں۔" جگدیش نے قہقہہ لگایا۔ "یہ آج کل ہزاروں آدمی بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہیں اور نہیں پکڑے جاتے لیکن یہ بیچاریاں فوراً دھرلی جاتی ہیں۔ ان ریل والوں کو کچھ دیا اور ترس نہیں۔"

ایک مسافر نے ازراہ لہجہ میں بہت چپکے سے کہا۔ "لڑکی کی وجہ سے!" اور پھر اپنے اس مذاق پر خود ہی بہت زور سے ہنسے۔

جگدیش نے بڈھی عورت کی طرف اشارہ کرکے کہا: "پانچ سال ہوئے جب نواب صاحب نے اس کے شوہر اور لڑکے کو سزا کروا دی تھی۔ اب اس نے نہیں معلوم کس سے سُن پایا ہے کہ اس کا لڑکا تو مر گیا اور شوہر لکھنؤ جیل میں ہے۔ یہ بھاگی لکھنؤ جا رہی ہے اور کہتی ہے کہ میں جیلخانہ جاؤں گی۔"

"آپ نے ان دونوں کو اپنی نگرانی میں لے لیا ہے؟" ایک جان پہچان نے پوچھا۔

"کیا کروں مجھے ان پر بڑا ترس معلوم ہوا۔ میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں اور وہیں جا رہا تھا، کوشش کروں گا کہ یہ بڑھیا کسی نہ کسی طریقہ سے اپنے شوہر سے مل لے۔" جگدیش نے منہ سکھا کر کہا۔ لیکن نوجوان لڑکی کی طرف دیکھ کر اس کی آنکھوں میں

ایک لمحہ کے لئے جو چمک پیدا ہوئی اس کو دیکھ کر میں لرز گیا!! اس چمک میں ننگی ہوس کے ہزاروں اژدہے اینڈ رہے تھے!۔

"لڈو سندیلہ کا" کی چیخ و پکار کے درمیان سندیلہ آگیا۔ میں اور مولانا نور عالم منفی وضو کا لوٹا اپنا اپنا اسباب بغل میں دبائے اُتر پڑے۔ ڈبہ سے نکلتے وقت میں نے آخری بار بدنصیب عورت اور اس کی لڑکی کی طرف دیکھا ——

مولانا نور عالم نے میرے ایک کہنی ماری اور جب دیکھا کہ میں لڑکی کی طرف دیکھ رہا ہوں تو بڑے زور سے لاحول پڑھی اور غصہ سے میرا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔

گاڑی چھوٹ گئی اور پچھلے پہر کی تاریکی میں گم ہو گئی البتہ اس کی پشت کی سرخ روشنی فضا میں ایک آتشیں لکیر بناتی چلی گئی —— لیکن کتنی دیر کے لئے! میں رات بھر کا تھکا ماندہ ذرا دم لینے کے لئے بیٹھ گیا۔

ریل چلتی رہتی ہے اور زندگی گذرتی رہتی ہے!
ریل چلتی رہے گی اور زندگی گذرتی رہے گی!
لیکن کبھی ریل چلتے چلتے اُلٹ بھی جاتی ہے!
کیا کبھی ——؟؟

مولانا نور عالم نے مجھ کو جھنجھوڑ کر کہا۔ "رات بھر سونے کے بعد اب بھی اونگھ رہے ہو کیا؟ لوٹا نہیں ہے تو بتاؤ میں استنجا کیسے کروں؟ تم تو سو رہے ہو اور یہاں ...."

ایک جھلک

پہلا منظر

ایک بڑی میز کے گرد ایک پنڈت ایک مولوی۔ ایک پادری، اور ایک بدھ بھکشو اپنے اپنے مذہبی لباس میں بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے بڑی بڑی موٹی کتابوں کا انبار لگا ہوا ہے۔

مولوی۔ دیکھو ہمارا ہی مذہب ہے جس نے دنیا کو سب سے پہلے مساوات اور جمہوریت کا سبق دیا۔

پادری۔ لیکن ہاں یہ تمھارا ہی مذہب ہے جس نے سب سے زیادہ خلق خدا کا خون بہایا۔

مولوی۔ تم اپنے آپس کی خانہ جنگیاں بھول گئے۔ ہم نے محض مدافعت کے لئے تلوار اٹھائی، اور اگر ہم تلوار نہ اٹھاتے تو آج دنیا میں توحید بھی نہ ہوتی۔

بھکشو۔ لیکن تمھاری توحید سے دنیا کو فائدہ ہی کیا؟

پادری۔ خیر جو کارنامے ہم نے محض اچھی مثال اور نیک صلاح سے
ہیں وہ تمھاری تلوار کی قطع و برید کبھی نہیں کر سکی۔

پنڈت۔ بجا ارشاد۔ مذہب کے نام پر جتنا تم نے لوگوں کو پریشان کیا، شاید ہی کسی نے کیا ہو، تمھارا مذہب تو محض تمھاری ملوکیت کا پروپیگنڈا ہے۔
مذہب کے پرچار میں، جو کام ہم نے کیا ہے......

مہنت۔ بس بس آپ تکلیف نہ کیجیے۔ مذہب کا ڈھونگ رچا کر تم نے اپنے ہی مذہب والوں پر وہ ظلم توڑے ہیں کہ توبہ بھلی۔

پنڈت۔ قطع کلام معاف سوپ تو سوپ چھلنی کیا بولے جس میں بہتر چھید۔

مہنت۔ جی ہاں۔ بس عیسائیوں نے جو جو دھوپ صدی میں کیا وہ تم اب بھی کر رہے ہو۔

پادری۔ غلط بالکل غلط۔

مولوی۔ بالکل ٹھیک کہتا ہے۔

پادری۔ اپنی آنکھ کا شہتیر تو دیکھو تم! تم لوگوں کو خبر بھی ہے۔

مولوی۔ سب خبر ہے، آپس میں تم لوگوں نے ایک دوسرے کو زندہ جلا ڈالا۔

پادری۔ اور تم نے اپنے آپس میں لڑ لڑ کر کیا نہیں کیا؟

مولوی۔ چپ رہیئے آپ مجھے کہنے دیجیے۔

مہنت۔ میں کہہ رہا تھا۔

پنڈت۔ جھوٹ کہہ رہے تھے تم۔

پادری۔ یہ سب فضول کی بات چیت ہے۔

مولوی۔ خاموش رہیئے آپ!

(ایک ہنگامہ برپا ہوجاتا ہے)

ملازم آکر اطلاع دیتا ہے کہ کھانا تیار ہے۔

(سب خاموش ہوجاتے ہیں)

پادری۔ ہاں تو لے آؤ۔ دیکھو گوشت خوب بھن گیا۔

پنڈت۔ رام رام میں تمہارے ساتھ نہیں کھا سکتا۔ دیکھو میرا کھانا بالکل الگ آئے۔

مہنت۔ اور وہ پانی چھان لیا تم نے۔

مولوی۔ دیکھو خوک لئیم سے میری پلیٹ چھو بھی نہ جائے۔

(پردہ)

(دوسرا منظر)

سب الگ الگ بیٹھ کر ایک دوسرے کی طرف سے پیٹھ کر کے جلدی جلدی بڑے بڑے نوالے کھا رہے ہیں۔

ملازم آکر اطلاع کرتا ہے۔ "دو بھوکے فقیر دروازے پر شور مچا رہے ہیں"۔

سب جلدی سے اپنے ہاتھ کے نوالے منہ میں رکھ لیتے ہیں۔

تھوڑی دیر تک سب ایک دوسرے کی طرف تکنے لگتے ہیں۔

پادری۔ کچھ ہے نہیں تمہارے پاس۔

ملازم۔ بس تھوڑا سا گوشت ہے۔

پنڈت۔ (گھبرا کر) کس چیز کا؟

مولوی۔ (گھبرا کر) کس چیز کا؟ سور کا؟

مہنت۔ وہ ہیں کون مذہب؟

ملازم جاتا ہے اور لوٹ کر جواب دیتا ہے۔

ملازم۔ وہ سمجھتے ہی نہیں کہ مذہب کس کو کہتے ہیں

مولوی۔ دیکھو سور کا گوشت مت دینا۔

ہندو۔ دیکھو انھیں بھرشٹ نہ کرنا۔

ملازم۔ تو بھگا دوں انھیں؟

سب خاموش ہو جاتے ہیں۔

(پردہ)

(تیسرا منظر)

سب پھر میز کے گرد بیٹھے ہیں۔ ملازم آ کر کہتا ہے۔

ملازم۔ وہ بھوکے بیٹھے ہیں۔

مولوی۔ بلا لاؤ۔

پادری۔ ہاں ہاں لے آؤ۔

پنڈت۔ کیا ہوگا انھیں بلا کر۔

مہنت۔ آنے تو دیجئے۔

دو ضعیف بڈھے چیتھڑوں میں کانپتے ہوئے .... داخل ہوتے ہیں

مولوی۔ تم کون مذہب ہو۔

پہلا بڈھا۔ مذہب؟

پنڈت۔ تمہارا دھرم کیا ہے۔ ہندو، مسلمان۔؟

دوسرا بڈھا۔ ہم لوگ بہت بھوکے ہیں۔ ہمارا دھرم کیا؟

پادری۔ تم لوگ ایمان کے بھوکے ہو۔ تم کو یہ نہیں معلوم کہ تم کو کس نے پیدا کیا۔ اور تم کو کون نجات دیگا۔

مولوی۔ تم نے کبھی اپنے خالق کے سامنے سر نہیں جھکایا؟

پنڈت۔ تم کو ذرا بھی اپنے دھرم کا خیال نہیں؟

(دونوں بڈھے حیران رہ جاتے ہیں)

دوسرا بڈھا۔ ہم بہت بھوکے ہیں۔ کل سویرے سے روٹی نہیں کھائی۔

جھنت۔ تمھاری آتما بھوکی ہے

مولوی۔ جلدی اپنے معبود کے سامنے سر جھکاؤ۔

پہلا بڈھا۔ معبود۔ معبود کیا؟

پنڈت اور پادری (ساتھ ساتھ) خدا، پرمیشر۔

(بڈھے ہکابکا رہ جاتے ہیں)

مولوی۔ تم خدا کو نہیں جانتے؟

پنڈت۔ پرمیشر کو نہیں پہچانتے؟

پہلا بڈھا۔ میں نے صرف نام سنا ہے۔
پادری۔ تو کیا تم خدا کو دیکھتے۔
پہلا فقیر۔ ہاں۔ خدا ہی کیا؟
مولوی۔ جس نے تمھیں یہ سب نعمتیں دیں۔
دوسرا بڈھا۔ کون؟

(مولوی خاموش ہو جاتا ہے)

پادری۔ تمھیں پیدا کیا۔ تم کو.........
(فقیروں کی حالت دیکھ کر وہ کچھ کہتے کہتے رُک جاتا ہے)
دوسرا بڈھا۔ سردی سے ہم ٹھٹھرے جاتے ہیں۔ ہمیں روٹی دیجئے خدا کے نام پر۔
مولوی۔ تم مسلمان ہو جاؤ۔
پادری۔ تم عیسائی ہو جاؤ۔
دونوں بڈھے۔ روٹی کون دے گا؟
(مولوی اور پادری ایک دوسرے کا منھ تکنے لگتے ہیں)
مولوی۔ خدا۔
دوسرا بڈھا۔ خدا کہاں ہے؟ ہمیں روٹی دے۔
جنت۔ روٹی تو ختم ہو گئی۔

(دونوں بڈھے بڑبڑاتے چلے جاتے ہیں)

مولوی۔ جل جلالہٗ۔ خدا کا شکر ہے آج ایک وقت کی بھی نماز قضا

نہیں ہوئی۔ نماز پڑھ کر کیسی طبیعت خوش ہوتی ہے۔

پادری۔ اے خدا ہمیں ہماری روزانہ کی روٹی دے۔ خدا سے دعا مانگ کر کیسا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

پنڈت۔ بس رے رام۔ اس سردی میں بھی میں اشنان کر آیا۔ دل صاف ہو گیا۔

(پردہ)

چوتھا منظر

ایک تاریک گلی ....

دونوں بڑھے فقیر اندھیرے میں بڑبڑاتے چلے جا رہے ہیں۔ راستے میں ایک تیسرا فقیر ملتا ہے۔

تیسرا فقیر۔ کچھ ملا۔

دونوں فقیر۔ کچھ نہیں۔!

تیسرا فقیر۔ لو (ایک ایک روٹی دیتا ہے)

پہلا فقیر۔ کہاں مل گئی؟

تیسرا فقیر۔ وہی کلو نانبائی آج جوئے میں جیت گیا۔ اس نے مجھے چھ روٹیاں دیں۔ تم کہاں تھے؟

دوسرا فقیر۔ اسی طرف تھے۔ ایک جگہ ملنے کی امید تھی، وہیں بیٹھے رہے۔

تیسرا فقیر۔ پھر کیا جواب ملا؟

دونوں فقیر۔ مذہب۔ خدا۔ پرمیشر۔ بھگوان۔

تیسرا فقیر۔ اونچی دوکان پھیکا پکوان۔

(تینوں فقیر بڑی زور سے قہقہہ لگاتے ہیں۔)

(پردہ)

گستاخ شیطان

صبح کا سہانا وقت تھا، رات کی گرمی سے دیر تک جاگی ہوئی۔ دنیا ابھی خاموش تھی اور سورج کی پہلی کرنیں شرماتی لجاتی ہر بلندی کی پیشانی چوم رہی تھیں۔ نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر مولوی ابن القدس صاحب اپنے مکان کے کشادہ صحن میں ایک قالین پوش چوکی پر گاؤ تکیہ کا سہارا لئے حقے کے میٹھے میٹھے کش کھینچ رہے تھے، اپنے معبود کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے بعد وہ ایک عجیب سکون و کیف سے سرشار تھے، اس وقت دنیا کی ہر فکر سے بے نیاز وہ اپنے سینے میں کچھ ایسی ٹھنڈک محسوس کر رہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں دل کے بجائے ایک برف کا ڈھیلا دھڑک رہا ہے، حقے کے میٹھے میٹھے خوش گوار کش مولوی صاحب کی آنکھیں بند کئے دیتے اور وہ کچھ ایسا لطف محسوس کرتے گویا جنت میں حوریں ان کے ہاتھ پیر اور سر دبا رہی ہوں۔

آہٹ ہوئی، مولوی صاحب نے سر جو اٹھایا تو ایک بڈھا سفید داڑھی والا متقد جس کے معصوم چہرے سے خشوع و خضوع کی شعاعیں نکل رہی تھیں

نہایت مودبانہ ایک روپیہ نذر لئے ہوئے کھڑا تھا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے" کہہ کر مولوی صاحب نے ازراہِ غربا پروری نذر قبول کرلی۔ اور روپے کو تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ معتقد نے مولوی صاحب کے ہاتھ پیر چومے اور ان کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

مولوی صاحب۔ کہو کیسے آئے کیا کام ہے تمھارا۔

معتقد۔ حضور میں بہت ہی گنہگار ہوں، اور بہت ہی غریب آدمی ہوں، آپ دعا کریں۔

مولوی صاحب۔ انشاء اللہ۔

معتقد۔ حضور اب تو فاقے کرتے کرتے جان پر بن آئی ہے، اب آپ ہی کچھ زور لگا دیں۔

مولوی صاحب (ہاتھ اٹھا کر) رزاق تم پر اپنے رزق کے دروازے کھول دے!

معتقد۔ حضور میں نے خود خدا سے بے حد دعا مانگی، بہت نذر و نیاز کی لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

مولوی صاحب۔ واسطے کی ضرورت ہے۔ اس معبود حقیقی کی بارگاہِ عالی تک ہر کہ ومہ کی تھوڑی ہی رسائی ہے (بارگاہ کی عظمت و جلالت کے خیال سے مولوی صاحب کو ایک جھرجھری معلوم ہوئی) جل جلالہٗ!

معتقد۔ میں سمجھا کہ شاید خدا صرف امیروں کی دعا سنتا ہے جو پلاؤ زردے پر نذر و نیاز دلا سکیں۔ جو اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لئے بزرگوں کے وسیلے حاصل

کر سکیں۔

مولوی صاحب۔ (تیز ہو کر) خاموش، یہ کیا کفر بکتے ہو۔ خدا تو ہر ایک کے لئے ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔

معتقد۔ پھر وہ غریبوں کی سنتا کیوں نہیں؟

مولوی صاحب۔ دیکھو تم دائرہ ایمان سے خارج ہوئے جا رہے ہو۔ اس کی مشیت میں چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ اس نے ہر ایک کی جداجدا تقدیر بنائی ہے، اور اسے ہر ایک کا جداجدا امتحان مقصود ہے۔

معتقد۔ تو پھر جو کچھ تقدیر میں ہے وہ پلٹ نہیں سکتا۔

مولوی صاحب۔ (جوش عقیدت سے اپنی داڑھی پکڑ کر) نہیں کبھی نہیں۔

معتقد۔ تو پھر آپ لوگ دعائیں کیوں مانگتے ہیں۔

مولوی صاحب۔ (خفا ہو کر) تم جاہل ہو اسے سمجھ نہیں سکتے۔!

معتقد۔ انسان وہی کرتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے؟

مولوی صاحب۔ بیشک۔ خدا تعالیٰ کی مرضی کے بغیر ایک پتہ تک ہل نہیں سکتا۔

معتقد۔ تو پھر یہ ہمارے گناہ پہلے ہی سے ہماری قسمت میں لکھے ہوتے ہیں۔

مولوی صاحب۔ بیشک۔

معتقد۔ اور جو کچھ ہماری قسمت میں لکھا ہوا ہے اگر وہ ہم نہ کرتے تو ہم خدا کی حکم عدولی کرتے۔

مولوی صاحب۔ حکم عدولی کے کیا معنی۔ خدا کے حکم کے بغیر ہم کچھ کر ہی

نہیں سکتے۔

معتقد۔ پھر ہمارے گناہوں کی سزا کس کو ملے گی؟

مولوی صاحب۔ تم کو اور کس کو؟

معتقد۔ میں نے تو جتنے گناہ کئے ہمیشہ مجبور و ناچار ہو کر کئے۔

مولوی صاحب۔ (خفا ہو کر) چپ رہو تم۔ بڑے آئے وہاں سے مجبور و ناچار ہو کر گناہ کرنے والے۔

معتقد۔ پھر آخر کیا فاقے کرتے کرتے مر جائیں، مذہب روٹی دے گا۔

مولوی صاحب۔ روٹی خدا دیتا ہے۔ صبر کرو۔ شکر کرو۔ ہر حال میں اسکے سامنے سر تسلیم خم رکھو۔ ہر بات میں اس کی مشیت پر قانع رہو۔

معتقد۔ (غصے میں) مرے کو سب ہی مارتے ہیں۔ مذہب غریبوں کو یہی سکھاتا ہے کہ بس صبر کرو، شکر کرو، مذہب امیروں کو کیا سکھاتا ہے؟

مولوی صاحب۔ یہی کہ صبر کرو، شکر کرو، غریبوں سے ہمدردی کرو۔

معتقد۔ تو بس مذہب امیروں کے لئے ہے، جو صبر و شکر کر سکتے ہیں۔

مولوی صاحب۔ لعنت اللہ، کیا بکتے ہو تم۔ مذہب تمام خلق اللہ کے لئے ہے۔

معتقد۔ غریب کا مذہب تو روٹی ہے، آپ کے قانون میں چوری ناجائز اور بھوکے کے قانون میں چوری جائز ہے، آپ کے قانون میں صبر و شکر اور بھوکے کے قانون میں چھین جھپٹ۔

مولوی صاحب۔ مذہب سب کے لئے ایک ہے۔

معتقد۔ اور یہی اس کی کمزوری ہے۔

مولوی صاحب۔ (خفا ہو کر) دور ہو تم شیطان۔ بہکانے چلے ہو ہم کو، تدبر و تفکر شیطانی مشغلے ہیں، جن سے مذہب کی طرف سے شک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ ورغلاتا ہے ہمیں۔!

معتقد۔ (طنز سے) جی نہیں آپ تقلید و تعصب سے اپنی مذہبی بنیادیں مضبوط کرتے رہیئے!

معتقد نے بڑے خطرناک طریقے سے مولوی صاحب کی داڑھی کو گھورا مولوی صاحب کچھ سمجھ گئے، اور فوراً ہی چیخ اُٹھے۔ آنکھ کھل گئی، سارے صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی، حقہ جل چکا تھا۔ مولوی صاحب آنکھ ملتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کمبخت شیطان ورغلانے چلا تھا ہمیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے باپ دادا کے مذہب پر قائم رہا۔"

مولوی صاحب نے احتیاطاً تکیہ اٹھا کر دیکھا کہ شاید نذر کا روپیہ اس کے نیچے ہو، لیکن وہ گستاخ شیطان اپنے ساتھ ہی لیتا چلا گیا تھا۔

دیکھی نہ آپ نے بے ایمانی!!

عشرتِ امروز

مجھے نہیں معلوم کہ میرا باپ کون تھا اور کب مرا۔ مجھے اپنی زندگی کا پہلا واقعہ یہ یاد ہے کہ میری دادی بھیک مانگنے جارہی تھی اور مجھ میں اور میری بہن جنی میں اس بات پر لڑائی ہوگئی کہ وہ کہتی کہ وہ اس کے ساتھ جائے گی اور میں کہتا کہ میں۔ ماں نے اپنا فیصلہ جنی کے حق میں کیا اور میں روتا رہ گیا۔ میری عمر اس وقت چار برس کی تھی۔ اور جنی مجھ سے کچھ ہی بڑی تھی۔

دادی بہت جلد ہی ختم ہوگئی۔ وہ اکثر رات کو بھی بھیک مانگنے جایا کرتی۔ ایک روز رات کو غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ دادی نے کہا کہ اس کو بخار ہے اور اس کا بدن ٹوٹ رہا ہے وہ کہیں نہیں جائے گی لیکن ماں نے اسے زبردستی ڈھکیل ڈھکیل کر پھر بازار میں بھیج دیا۔ وہ دوسرے دن پھر نہیں آئی۔ شام کو میں اور جنی اسے ڈھونڈھنے نکلے۔ اندھے کلو نے جو اسکول کے نکڑ پر بیٹھ کر بھیک مانگتا تھا بتایا کہ وہ نالہ میں گر کر مرگئی۔ فقیروں کو ایک دوسرے کی بات خوب معلوم ہو جایا کرتی ہے۔ دادی کے مرنے کا مجھے بہت افسوس ہوا اور میرے آنسو نکل پڑے۔ لیکن جنی خاموش رہی۔ راستہ میں

جینی نے مجھ سے کہا "اچھا ہوا مر گئی روز اماں سے لڑتی"

جینی نے جب دوڑ کر ماں کو دادی کے مرنے کی خبر سنائی تو وہ ذرا بھی خوش نہ ہوئی بلکہ خاموش ہو گئی۔ رات کو اس نے مجھسے اور جینی سے کہا "اب روٹی اور چاول کون لائے گا؟ تم لوگ بڑے ہوتے تو نوکری ہی پر جاتے۔ کل جینی کو لے کر بازار جاؤں گی"

"اس کو بیچنے" میں نے پوچھا۔

"جہاں میں کام کرتی ہوں وہیں نوکر رکھانے"

جینی بہت خوش تھی اور میں بہت رنجیدہ لیکن جب دوسرے دن ماں بازار جانے لگی تو مجھ کو بھی اپنے ساتھ لیتی گئی۔ بیگم صاحب کا بازار میں بہت بڑا مکان تھا۔ انہوں نے اپنا بچہ کھلانے پر جینی کو رکھ لیا۔ جینی بڑی خراب نکلی وہ اپنی ملازمت پر اتنا مغرور ہوئی کہ دن بھر بچہ کو وہی کھلایا کی میں ذرا چھو بھی لیتا تو بڑی زور سے ڈانٹی اور کہتی کہ "ابھی بیگم صاحب سے کہکر پٹوا دوں گی"۔ شام کو جب میں تنہا ماں کے ساتھ گھر لوٹا تو جینی مجھے بہت یاد آئی۔ میں نے پوچھا "ماں اب وہ کبھی گھر نہ آئے گی" ماں نے چمکار کر کہا "آئے گی کیوں نہیں جب چھٹی ملے گی تب گھر آئے گی"۔

میں نے کہا "بیگم صاحب تو کہتی تھیں وہ دن رات وہیں رہے گی"

"اونھ! ان کے کہنے سے کیا ہوتا ہے بھاگ آیا کرے گی"

(۲)

کئی برس گزر گئے۔ میری عمر اب بارہ چودہ سال کی تھی اور میں کئی جگہوں سے نکال دیئے جانے کے بعد ایک وکیل صاحب کے یہاں ملازم تھا۔ امی بدستور بیگم صاحب کے یہاں کھلائی تھی وہ کئی دفعہ بار بار نکالی گئی تھی اور بھاگ بھی چکی تھی۔ لیکن ہر دفعہ بیگم صاحب اسے بلا کر پھر رکھ لیتیں۔ اس کی ملازمت مستقل معلوم ہوتی کیوں کہ بیگم صاحب کے ہر سال بچہ ہوتا۔ ماں نے عجیب کرشمہ دکھایا تھا۔ بیگم صاحب کے یہاں سے وہ ایک اجنبی باورچی کے ساتھ بھاگ گئی لیکن پھر وہ محلہ کے درزی کے گھر میں چلی گئی تھی اور وہیں درزی کے ساتھ رہتی تھی۔

وکیل صاحب کے یہاں شروع شروع مجھ پر بہت مار پڑی لیکن رفتہ رفتہ میں تجربہ کار ہو گیا تھا اور مجھے مار سے بچنے کے بہت سے طریقے معلوم ہو گئے تھے۔ مثلاً میری ملازمت کے دوسرے ہی دن وکیل صاحب کی بی بی "باجی" نے مجھ سے مٹھائی منگائی اور سخت تاکید کی سڑک پر رحمٰن حلوائی کے یہاں سے لانا اور گلی کی نکڑ والے حلوائی نتھو کے یہاں بھول کر بھی نہ جانا۔ میں نے لفظ بہ لفظ تعمیل ارشاد کی لیکن اس کے باوجود وکیل صاحب نے کہا کہ تو نتھو ہی کے یہاں سے لایا ہے میں نے لاکھ لاکھ قسمیں کھائیں لیکن مجھ پر بہت زیادہ مار پڑی۔ گھر کے دوسرے ملازم کرمو سے جب میں نے اس ظلم اور ناانصافی کی فریاد کی تو اس نے ہنس کر کہا "تو تو ہے بے وقوف۔ مٹھائی جب لانا نتھو ہی کے یہاں سے لانا۔ وہ ایک گلاب جامن گھاتے میں دیتا ہے۔ صرف یہ کرنا کہ جب دونا باجی کے پاس لے جانا تو ان سے کہنا 'باجی رحمٰن نے آپ کو سلام کہا ہے۔ وہ ان کے میکے کا حلوائی ہے

کریموں کا یہ نسخہ تیر بہدف ثابت ہوا۔ اسی طرح اس نے اور بھی بہت سے مجرّب نسخے بتائے اور کچھ اپنے مجربات کی بنا پر میں نے بھی فراہم کئے۔ لیکن مار زیادہ تر خطا اور قصور پر نہیں پڑتی مار تو مارنے والے کی افتادِ طبیعت ہے اس کے لئے کوئی قید و بند نہیں ہو سکتی۔ میں لاکھ جھوٹ بولتا اچھے سے اچھا چکمہ دیتا لیکن وکیل صاحب جب مارنے پر آتے تو کھال ادھیڑ ہی کر رکھ دیتے ان کی مار کچھ دنوں تک تو بہت تکلیف دہ معلوم ہوئی لیکن پھر میں اس کا عادی ہو گیا اور اس سے مجھے کچھ زیادہ تکلیف اور پریشانی نہ ہوتی بلکہ وہ ایک طرح سے میرے حوائج ضروری میں شامل ہو گئی تھی۔

وکیل صاحب کے یہاں سے جب میں نکالا گیا تو اس وقت اگرچہ میری عمر بیس سال سے بھی کم تھی لیکن ان کی تربیت اور اپنے ماحول کے تقاضے سے میں جھوٹ بولنے میں چکمہ دینے میں اور گھر کی چھوٹی چھوٹی چیزیں اڑا دینے میں اچھی قسم کا ایک کامیاب شاطر تھا۔

(ھ)

کئی مہینے تک میں بیکار آوارہ گردی پھرا کیا۔ اس عرصہ میں مجھے اگر ملازمتیں ملیں بھی تو دو چار دن کی۔ نہ معلوم کیوں لوگ مجھے چور اور بدمعاش سمجھتے۔ میرے جاننے والے بھی مجھ سے نفرت کرتے اور میرا مذاق اُڑاتے۔ بازار سے جب میں گزرتا تو میرا کوئی پرانا ملاقاتی مجھ سے چیخ کر کہتا "رجو تیری اماں کدھر بھاگ گئی" کوئی مجھے چھیڑتا "درزی کے بیٹے ادھر آ" یہ طعنے سن کر میں جھینپ جاتا اور صرف بغلیں ہی جھانکتا رہ جاتا۔

بیکاری کے زمانے میں میں کھانا کھانے ماں کے یہاں چلا جاتا۔ جب تک درزی گھر میں رہتا میں ادہر ادہر سڑک پر چکر لگایا کرتا۔ اس کے دوکان چلے جانے کے بعد میں گھر میں جاتا۔ ماں میرے لئے بچا کھچا کھانا رکھ چھوڑتی میں کھانا لیکر فوراً بھاگ جاتا کہ کہیں درزی کا کوئی رشتہ دار مجھے دیکھ نہ لے۔ جنی سے مجھ سے بہت کم ملاقات ہوتی۔ اکثر وہ بازار میں مل جاتی۔ اب وہ جوان تھی اور جب راہ چلتی تو لوگ ادہر ادہر سے اس پر آوازے کستے۔ مجھے اس کو دیکھ کر بڑی شرم آتی، ایک روز میں ٹھیک دوپہر میں اس کے گھر پہونچا۔ آج درزی دوکان پر نہ گیا تھا اور مجھے کھانا نہ ملا تھا میں نے اپنے دل میں کہا چلو آج جنی ہی کی خبر لی جائے۔ جنی میرے پاس بہت ڈرتے ڈرتے آئی۔

میں نے پوچھا "ڈر کیوں رہی ہے؟"

کہنے لگی "کوئی تم کو یہاں دیکھ نہ لے۔"

میں نے کہا "کیوں؟"

بولی "کل بیگم صاحب کے بندے کھو گئے تھے۔ انھوں نے مجھ ہی پر چوری لگائی اور بہت پٹوایا جب میں نے کہا کہ میں بندے لیکر کیا کروں گی تو کہنے لگیں تیری ماں اور تیرا بھائی شہر بھر میں پکے بدمعاش مشہور ہیں ان ہی کو دیدے گی۔"

"تو کیا تم نے واقعی بندے چرائے تھے؟"

"وہ کھکھلا کر بولی "ہاں"۔

"پھر لا مجھے دیدے دو مہینے سے بھیک مانگ رہا ہوں۔"

اس نے منھ بنا کر کہا "بڑے آئے وہاں سے مانگنے والے۔ کبھی بہن کو کچھ

نہ دیدیا۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "دیدے میں تجھے بیچ لادوں گا۔" میں نے اپنا پیٹ دکھایا "دیکھ دو دن سے ایک کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہیں گئی۔"

"یوں نہیں دوں گی پہلے ایک وعدہ کر۔"

"بتا۔ تو ہی تو دیر کر رہی ہے۔"

"کسی سے کہنا مت۔ میرے پاس پچیس روپئے اور ہیں۔"

میں زمین سے دو بالشت اچھل پڑا "سچ!"

"لیکن ایک بڑی خراب بات ہوگئی۔"

"وہ کیا؟"

"آؤ ہم تم کہیں بھاگ چلیں۔"

"ارے میں ایسی جگہ روپیہ چھپادوں کہ کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو۔"

"یہ نہیں" اس نے سر جھکا کر کہا کہ "میرے پیٹ میں بچہ ہے۔"

"پھر!" میں متعجب رہ گیا۔

"تو بھاگ چلو" اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں

"روپیہ تو لایا ایسے ہی" میں نے کہا۔

"روپیہ لاتی ہوں لیکن آج ہی شام کو چلے چلنا"

چھنی چند منٹ کے لئے گھر گئی اور وہاں سے ایک میلا کچیلا بٹوہ لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میں نے اسے کھولا تو اس میں پچیس روپے اور سونے کے بندے تھے۔ میں نے جلدی سے بٹوے کو گلیٹ میں رکھ لیا۔

"تو کیا آج شام ہی کو چلنا ضروری ہے؟"

"بس اب دن ہی کتنے ہیں میں گھر بھر سے اپنا منھ چھپائے چھپائے پھرتی ہوں۔"

"تو آخر تو نے یہ کیا گن دکھایا۔ ناک کاٹ لی خاندان بھر کی۔ اب میں کیا کسی کو منھ دکھاؤں گا۔"

"آج شام کو آجانا آٹھ بجے۔"

(۴)

میں چپ چاپ جینی کے یہاں سے چلا آیا۔ مجھے بڑی تیز بھوک لگی تھی۔ سب سے پہلے میں نان بائی کے یہاں پہونچا اور خوب شکم سیر ہو کر کباب۔ کوفتے، شیرمال اور پلاؤ کھایا۔ زندگی بھر میں مجھے کبھی ایسا کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ میں نے خوب کھایا اور برف کا پانی پی کر جب دوکان سے نکلا تو مجھ سے چلا نہ جاتا اور مجھے بڑے زوروں سے نیند آ رہی تھی لیکن دن میں سڑک پر کہاں سوتا؟ دفعتاً مجھے بڑی دور کی سوجھی "کیوں نہ آج لیلاوتی کی دعوت کر دی جائے۔" میں خوش خوش گنگناتا ہوا لیلاوتی کے یہاں چلا گیا۔ دوپہر بھر وہ مزے رہے ہیں کہ کیا پوچھنا۔ مجھے یقین نہ آتا کہ میری قسمت میں بھی ایسے مزے لکھے تھے۔ شام کو میں لیلاوتی کے کوٹھے سے اترا تو پھر پیٹ کی دوزخ دہک رہی تھی۔ مجھے کھانے کی جو سب سے پہلی دوکان ملی میں اسی میں گھس گیا۔ جب میں وہاں سے نکلا تو اندھیرا ہو چکا تھا، اور سڑک کی بتیاں جل رہی تھیں۔ میں کچھ دیر ادھر ادھر گھومتا رہا لیکن نہیں معلوم کیسے میں پھر لیلاوتی کے زینہ کے پاس پہونچ گیا۔ گھنٹہ گھر نے معاً آٹھ بجائے میں سرپٹ اسکے کوٹھے پر بھاگا جیسے ساری دنیا میرے پیچھے دوڑ رہی ہو۔

سرائے میں جہاں بہت نیچے درجے کی طوائفیں رہتیں لیلاوتی دیہات کی ایک نودارد طوائف تھی جسے ابھی اچھی طرح شہر کی ہوا نہیں لگنے پائی تھی۔ میرے اکثر ملاقاتی جو اس سے مل چکے تھے اسکے حسن اور جوانی اور ساتھ ہی ساتھ سستے ہونے کے بڑے مدّاح تھے۔ مجھے آج سے پہلے اتنا پیسہ ہی نہ جڑا تھا جو اس سے مل سکتا۔ اب جو موقع ملا تھا تو ـــــــ اس کے ساتھ کا ایک ایک لمحہ میں مضبوط پکڑنا چاہتا تھا۔ لیکن وقت گزر ہی جاتا ہے۔

دو روز بعد جب میں اس کے کوٹھے سے اترا بلکہ اس نے زبردستی اتار دیا تو میری جیب میں جنی کی امانت کے صرف تین آنے پیسے باقی تھے۔ اور ساری دنیا میں مجھے سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی!!

دس سال گزر گئے اور اس عرصہ میں میں نے اپنی ماں اور بہن جنی سے ملنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہی ہیں؟ میں ہردوئی جیل سے دو کانسٹبلوں کے ساتھ بریلی جیل بھیجا جا رہا تھا اور ہردوئی اسٹیشن پر گاڑی کے ایک تیسرے درجہ میں ہتھکڑی اور بیڑی پہنے بیٹھا تھا۔ درجہ کے باہر کوئی فقیرن بڑی دیر سے منمنا رہی تھی۔ میں کھنکار کر تھوکنے کیلئے کھڑکی کی طرف جھکا تو دیکھا کہ جنی ــــ وہ پہلے والی گدرائے جسم کی جنی نہیں بلکہ ایک کوڑھی بڑھیا ایک چھوٹے سے لڑکے کی انگلی پکڑے اور ایک بچے کو گود میں اٹھائے جس کا سارا جسم پھنسیوں سے لدا ہوا تھا اور جن پر مکھیاں بھن بھنا رہی تھی گڑگڑا کر بھیک مانگ رہی تھی۔ میں نے اسکے منھ پر تھوک دیا اور منھ پھیر کر بے حس و حرکت بیٹھ گیا۔

: